

رسالہ

# اہل السنۃ و الجماعۃ

یعنی

مولانا سید سلیمان ندوی

کے

اُن مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے اہل السنۃ و الجماعۃ کی نفوی و معنوی تشریح تاریخی سیات،  
ان کے مذہب کے اصول اولین کی تحقیق، اور مقبول و منقول کے  
اصول تطبیق پر "معارف" اعظم گڈہ میں لکھے

باہتمام محمد اویس دہلوی

مطبوعہ مسلم پریس ورکس پریس شہر عظیم گڈہ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام  
على سيد المرسلين وآله واصحابه اجمعين

قومون، ملکون اور ممتاز افراد انسانی کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے اور صاف  
خطر تھا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے لیکن کبھی اس پر بھی تم نے غور کیا کہ الفاظ کی بھی کوئی تاریخ ہو سکتی ہے؟  
کیا قومون، ملکون اور انسانوں کی طرح ان میں بھی انقلابات کا وہی مد و جزر ہے جس سے دنیا کا  
ایک ذرہ بھی مستثنیٰ نہیں،

صبر کا حقیقی مفہوم، عزم و استقلال، اور جمیعتِ خاطر اور اطمینانِ قلب کے ساتھ مصائب  
کی برداشت ہے، لیکن اب اس کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ کوئی زبردست گالی دے اور ہم  
خاموش رہیں، کوئی مارے اور ہم یہ کہہ کر چپ ہو جائیں کہ خداوند! ہم نے صبر کیا تو ہی اس سے مجھ  
کو خیر کا انتقام لینے والا ہے، لیکن کیا بیجائی کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ ہے؟

ظلم کے اصلی معنی جس میں قرآن نے اسکا استعمال کیا ہے، وہ خداوندِ عادل سے تجاوز ہے خواہ

وہ معاملہ اپنے نفس کے ساتھ ہو یا دوسرے کے ساتھ ہو کسی غریب کا امیر کے ساتھ یا امیر کا غریب کے ساتھ رعیت کا بادشاہ کے ساتھ یا بادشاہ کا رعیت کے ساتھ ہو، لیکن اب علی العموم اس کے معنی زیر دست و زیر دست کو سنا سمجھ جاتے ہیں،

**شریف** کا لفظ اصل میں رئیس کا مرادف تھا، پھر خاندان نبوی کے لئے استعمال ہوا اور اب اس کو شریف کہتے ہیں جس کے نسب میں نام سادی یا آبرو باختہ خاندان کی شرکت نہ ہو، **دہشت** کے صحیح معنی استعجاب و حیرت کے ہیں لیکن وہ اب خوف اور ڈر کے ہم معنی ہے، **اسلام** کے معنی آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کے عہد میں خدا کو ایک، پیغمبروں کو سچا، اور کلام الہی کو برحق ماننا تھا، لیکن اب صفات الہی کو عین ذات، یا زائد بذات، معجزات کا دلیل نبوت ہونا یا نہ ہونا، کلام کا مخلوق یا غیر مخلوق ہونا بھی اس کے معنی میں داخل ہے،

مسلمانوں میں ہر دور میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے، لیکن وہ نقش بر آب تھے ابھرے اور مٹ گئے، لیکن جو فرقہ کے عموم اور کثرت کے ساتھ باقی ہے اور آج مسلمان آبادی کا بیشتر حصہ ان کا عالم میں پھیلا ہے، وہ اپنے آپ کو فرقہ "اہل السنۃ والجماعۃ" میں شمار کرتا ہے، ذرا ہم کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ دوسرے الفاظ کی طرح "اہل السنۃ والجماعۃ" کے مفہوم میں بھی تو کوئی تغیر اور اس کی حقیقت میں بھی تو کوئی انقلاب نہیں ہو گیا ہے، عام طور سے اہل سنت کے معنی ہندوستان میں یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو شیعہ نہ ہو، آیا یہ تعبیر واقعہ کے مطابق ہے!

"اہل السنۃ والجماعۃ" میں نظروں سے مرکب ہے، "اہل" کے معنی اشخاص، مقلدین، اتباع اور پیرو کے پہان ہیں، "سنت" عربی میں راستہ کو کہتے ہیں، اور محاذاً روحش برنگی اور طرہ عمل کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے، "سنت" سے مقصود عام سنت نہیں، بلکہ اصلاح دینی میں حضرت رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز زندگی اور طریق عمل کو "سنت" کہتے ہیں، "جماعت کے لغوی معنی "تو گروہ" کے ہیں، لیکن یہاں جماعت سے مراد جماعت صحابہؓ ہے، اس لفظی تحقیق سے "اہل السنۃ والجماعۃ" کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے، یعنی یہ کہ اس فرقہ کا اطلاق ان اشخاص پر ہوتا ہے جن کے اعتقاد و اعمال اور مسائل کا محور پیغمبر علیہ السلام کی سنتِ صحیحہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اثر مبارک ہے،

"سنت" کا مقابل لفظ "بدعت" ہے، بدعت کے لغوی معنی نئی بات کے ہیں، اصطلاح شریعت میں اس کے یہ معنی ہیں کہ مذہب کے عقائد یا اعمال میں کوئی ایسی بات داخل ہو، جس کی تلقین صاحب مذہب نے فرمائی ہو۔ اور نہ اون کے کسی حکم یا فعل سے اس کا نشاء ظاہر ہوتا ہو، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ نے ان دو لفظوں کو انھیں معنوں میں مستعمل فرمایا ہے، اور کبھی "سنت" کے بجائے "ہدیٰ" اور بدعت کے بجائے "محدث" فرمایا، بدعت میں بھی یہ الفاظ مترادف ہیں، ہدیٰ طریقہ کو کہتے ہیں اور محدث کے معنی "نیا"۔

صحیح مسلم میں آپ کا وہ خطبہ مذکور ہے جس کو دیتے ہوئے آپ کی آنکھیں سُسُخ ہو جاتی تھیں، آداز بند ہو جاتی تھیں، اور لہجہ غضبناک ہو جاتا تھا،

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ بعد اس کے بہترین کلام خدا کا کلام ہے، بہترین و خیر الہدیٰ محمدی و بشریٰ لا مواءم و خیر اللہ کا طریقہ ہے، بدترین امور نبیؐ باتیں ہیں، محدثات و کُل بدعتہ ضلالتہ، اور نہ نئی بات گمراہی ہے،

مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے،

علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین میرا طریقہ اور میرے ہدایت یاب جانشینوں کا تمسک کر لو، وعضوا علیہا بالانواجذ وایاکم طریقہ اختیار کرو، اس کو اچھی طرح پکڑے رہو اور

وحد ثات الامار فان كل محدثه بدعة اس كودانت سے دباے ہو، ہاں نئی باتوں سے

وكل بدعة ضلالة بچنا، ہر نئی بات بدعت ہو اور سر بدعت مگر اچھی ہو،

ابوداؤد، ترمذی، اور ابن ماجہ میں ہے،

ایکروالمحدثات، فان كل محدثه ضلالة نئی باتوں سے بچنا، ہر نئی بات مگر اچھی ہے،

اس قسم کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ہیں، ان روایات میں آنحضرت

صلعم نے ”نئی بات“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اس کی تفصیل دوسرے موقوعوں پر آگئی ہے،

بخاری اور مسلم دونوں میں حضرت عائشہ سے مروی ہے،

من احدث فی امرنا هذا ما لیس ہمارے اس مذہب میں یا تعلیم میں جو ایسی نئی بات

منہ قہوارد۔ داخل کر گیا جو اس میں نہیں تو وہ بات مردود ہو،

صحیح مسلم میں ہے،

من عمل عملا لیس علیہ امرنا جو کوئی ایسا کوئی کام کر گیا جس پر ہمارا مذہب نہیں

قہوارد، وہ رد ہے،

ابوداؤد میں بائین الفاظ ہے،

من صنع امر اعلیٰ غیر امرنا قہوارد جس نے ہمارے مذہب کے خلاف کوئی کام کیا وہ رد ہے،

ان احادیث سے یہ واضح ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دنیا میں لائے، جن عقائد کی

تعمین آپ نے اپنی امت کو فرمائی، مذہب کا جو طریقہ عمل آپ نے متعین فرمایا، اس میں

ایک ذرہ کمی بیشی بھی بدعت ہے، اور کسی حال میں وہ اسلام کا جزو اور عنصر

نہیں قرار پاسکتی،

کسی قوم میں اصلاح کے طور کے بعد فساد کا یہ کیوں مکرر راہ پاتا ہے، شائع اسلام

علیہ النور التحیۃ والسلام اس سے بخیر نہ تھا، فرمایا،

ما من نبی بعثہ اللہ الا کان لہ من  
امتہ حواریون واصحاب یاخذون  
بسنۃہ ویقتدون بامساک ثمرانہا  
تخلف من بعدہم خلوف یقولون  
ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یمرون  
فمن جاہدہم ببیلۃ فیہم من  
ومن جاہدہم بقلبہ فیہم من  
ولیس وراۃ الذلت من الایمان  
حجۃ خد دل (مسلم)

خدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں فرمایا لیکن اس کے  
پسند خاص اتباع اور پیرو بنائے جو اسکی سنت کو اختیار  
کرتے ہیں اور اس کے مذہب کی اقتدا کرتے ہیں، پھر انکے  
بعد ایسی نسلیں آتی ہیں جو کہتی ہیں وہ کرتی نہیں،  
اور کرتی ہیں وہ جس کا اون کو حکم نہیں دیا گیا،  
جو اون سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہو، جو  
زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہو، اور جو دل سے جہاد  
کرے وہ مومن ہو، اس کے بعد رائی برا ایمان  
نہیں۔ (مسلم)

۲

اسلام کے اس حکم قطعی کے بعد کہ صاحب شریعت کے تعلیمات اور احکام پر کسی  
تسم کا اختلاف نہ کرنا یا اون میں سے کسی جز کو ساتھ کر دینا "سنت" کی بجائے اور "بدعت" کی  
پیشور شہ ہے، "اہل السنۃ" کے معنی واضح ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے بعد "واجبۃ" کا لفظ  
سامنے آتا ہے، اسلئے "واجبۃ" کی تفسیر بھی خود صاحب شریعت کی زبان سے سن لینی چاہیے،  
اسلام دنیا کے تفرون کو مٹا کر تمام دنیا کی ایک عمومی برادر سی قائم کرنے آیا تھا،  
وہ آیا بعد اپنے مقصدین کامیاب ہوا، اس نے عرب کے متفرق قبائل کو جو باہم دشمن  
یا کم از کم نا آشنا تھے، اون کی قبائل تقسیم کو مٹا کر صرف "جامعۃ اسلام" کے ایک رشتہ میں  
اون کو باہم متحد کر دیا، مہاجرین و انصار میں وہ اخوت پیدا کر دی کہ نسبی برادران

اس کے آگے پہنچ ہو گئیں،

کسی قوم میں کوئی ترقی اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی، جب تک اس کے تمام افراد کسی ایک نقطہ پر باہم اس طرح مجتمع نہ ہو جائیں کہ وہ نقطہ اجتماع اس کی زندگی کا اصلی محور بن جائے، اس کا تحفظ، اس کی بقا، اس کا وجود تمام افراد قوم کی زندگی کی غرض اصلی بن جائے، اس وقت اس مجموعہ افراد کو ایک قوم کہا جاسکتا ہے، اور وہی نقطہ اتحاد اس کا شیرازہ قومیت، رشتہ جامعیت، اور رابطہ وحدت قرار پائے گا، کسی قوم کی تباہی کا اصلی سبب یہی ہوتا ہے کہ اس کی قومیت کی یہ گرہ کھل جاتی ہے، اور تمام مجتمع افراد اس طرح متفرق و منتشر ہو جاتے ہیں کہ ہوا کا ایک ادنیٰ ٹھونکا اس کو کھیر دیتا ہے،

**یورپ کے تمام متمدن ممالک کا وجود جماعۃ وطنیت کے اندر پوشیدہ ہے،**  
**ہندوستان کی ترقی کی تمام کوششیں اس وقت تک بے اثر رہیں گی، جب تک**  
 اس کی تمام قوموں میں مذہب، یا وطن، یا زبان کسی چیز کا نقطہ اتحاد نہ پیدا ہو، اسلام نے اپنے سامنے دنیا کی عمومی برادری رکھی ہے وہ کسی ایک وطن کو، وہ کسی خاص جغرافیائی ملک کو صرف باہم متحد ہی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ تمام دنیا کو متحد کر دینا چاہتا ہے، تاکہ دنیا میں ایک عام امن و سلامتی پیدا ہو جائے، موجودہ جنگ کے مصائب اسی غلطی کے نتائج ہیں، یورپ کا رشتہ اتحاد وطن یا نسل ہی، جس کا اشتغال لا محالہ صرف ایک محدود نسلی یا جغرافیائی ملک پر ہوگا، اسلئے یورپ میں سیکڑوں جامعیتیں پیدا ہو گئی ہیں، اس وقت انگریز جرمن سے نہیں لڑتے بلکہ انگلستان جرمنی سے لڑ رہا ہے،

اسلام نے جغرافیائی اور نسلی امتیازات کو جن کے اندر کبھی تمام دنیا نہیں سما سکتی،

مشاکرہ مذہب کو جامعۃ ارتباط اور رابطہ جامعیت قرار دیا تاکہ دنیا کے جس حصہ اور

انسانوں کی جن فسقوں تک بھی اس کا دائرہ وسیع ہو وہ ایک برادرِ می کے اندر داخل ہو جائیں  
اسلام نے بار بار بلند کہا،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات) . . . مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں،

اسلام کے پیغمبر نے اس کی تفسیر میں کہا،

تَوَيَّ الْمُنِيبِينَ فِي تَرَاحِمِهِمْ وَتَوَادَّاهُمْ . . . مسلمان باہمی رحم، محبت اور مہربانی میں ایک

مکمل الجسد اذ اشتكى عضواً تداعى له . . . بدن کی طرح ہیں، دیکھو کہ ایک عضو کو بھی در و

سائر الجسد بالسهر والحمى . . . ہوتا ہے تو تمام بدن بخوابی اور تپ کی دعوت ایک

(بخاری و مسلم) دوسرے کو دیتا ہے،

پھر فرمایا،

الْمُؤْمِنُ الْمُنِيبُ كَالْبُنْيَانِ، يَشِدُّ . . . تمام مسلمان مثل ایک دیوار کے ہیں جسکے ایک حصہ

بعضه لبعضاً، . . . جوڑ کر دوسرا حصہ مستحکم ہو جاتا ہے،

ارشاد ہوا،

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يسلطه . . . ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اپنے ظلم کرے

(بخاری و مسلم) اور نہ اس کی اعانت ترک کرے،

آپ نے فرمایا،

كل المسلم على المسلم حرام دمه و . . . ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر تمام چیزیں حرام ہیں

ماله وعرضه (مسلم) . . . اس کا خون اور سکا مال اور اس کی آبرو،

ایک دفعہ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا،

انصر أخاك ظالماً أو مظلوماً . . . اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو،



صحابہ میں سے ایک نے عرض کی، "مظلوم ہو تو مدد کروں گا، لیکن ظالم ہو تو کیونکر مدد کروں؟ فرمایا اُس کی مدد یہ ہے کہ اُس کو ظلم سے باز رکھو۔  
اس مسئلہ صیغہ کی اہتمامی زندگی کی نسبت فرمایا،

ان الله لا يجمع امتي على الضلالة  
وید الله على الجماعة وسمي مشدداً  
مشد في النار (ترمذی)  
وہ دوزخ میں الگ ہوا (ترمذی)  
تفتقر امتي على ثلث وسبعين صلة  
میری امت تینہ ذوق پر منقسم ہوگی، بہتر  
تنتابہ سبعين في النار واحدة  
دوزخ میں اور ایک جنت میں، اور وہ  
في الجنة وهي الجماعة،  
جماعت ہوگی،

انہیں معنی کی اور بہت سی حدیثیں مروی ہیں، ان سے "اہل السنۃ" کے بعد والجماعۃ  
کی تفسیر ہوتی ہے،

اسلام میں "سنت" اور "جماعت" میں سے سب سے پہلے "جماعت" کا اصول ٹوٹا،  
اس جماعت شکنی نے سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا، یعنی عثمانیہ و سبائیہ  
یہ فرقہ خود صحابہ کے اخیر عہد میں پیدا ہو چکے تھے، سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے  
ملکی طرز عمل اور سیاسی انتظامات کی بنا پر دو فرقوں کا ظہور ہوا، ایک ان کا حامی اور  
طرفدار تھا، اور دوسرا ان کا مخالفت اور دشمن تھا، پہلا فرقہ تاریخ میں عثمانیہ کہلاتا ہے،  
اور دوسرے کا نام سبائیہ ہے (ابن سبائہ) یہودی نو مسلم تھا، جس نے مخالفین عثمان کو  
ایک شیرازہ میں مجتمع کیا تھا، عثمانیہ خالص عرب تھے، سبائیہ میں عرب و عجم دونوں غصہ

شامل تھے، ان دونوں قوموں کے خصائص طبعی بالکل مختلف ہیں، عرب تلوار کے دھنی ہیں، اور اہل عجم باتوں باتوں میں کام نہکانے کے عادی ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی دوسیدانوں کے بعد یہ فرقہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، ایک نے اپنے لیے علویہ یا شیعہ علی کا لقب پسند کیا، اور دوسرا خوارج کے نام سے مشہور ہوا، لوگ ان کو عموماً حواریہ کہتے تھے، (حمزہ اور ایک مقام کا نام تھا، جہاں اس فرقہ نے اپنی علیحدہ ہستی کا سب سے پہلے اعلان کیا) یہ تمام عرب تھے، اور نظریہ سابق کے مطابق اوس نے اپنے دعویٰ کا دو ڈھائی سو برس تک پیشہ تلواروں کے ذریعہ سے اعلان کیا، اور کبھی اوس نے خلفاء کے عہد کے سامنے سراطعت خم نہ کیا،

علویہ میں عرب کمتر لیکن اہل عجم کا بڑا حصہ شامل تھا، اسی لیے اس اخیر عصر میں تلوار کے بجائے سازشوں کا مادہ فطرۃ زائد تھا، اور جو عرب تھے وہ اپنی وفاداری پر قائم رہے، انصار کا ایک حصہ علوی تھا، اور بہت سے محدثین علوی تھے، یعنی حضرت علیؑ کو حضرت عثمانؓ سے افضل جانتے تھے،

فرقہ عثمانیہ سو برس تک بنو امیہ کی زندگی کے ساتھ قائم رہا، بعض صحابہ اور بعض اکابر محدثین اس فرقہ میں داخل تھے، اسماء الرجال میں بعض محدثین کے حالات کے ضمن میں اسکی تصریح ملتی ہے کہ وہ عثمانی یا علوی تھے، لیکن بنو امیہ کے زوال کے بعد اس فرقہ کا نام و نشان تک نہ تھا،

ان فرقوں نے تھوڑے دن کے بعد ملک کی جغرافیائی تقسیم کر لی، عثمانیہ شام میں، علویہ اور حواریہ عراق میں، اور اہل السنۃ حجاز میں، ابتداً عثمانیہ اور علویہ میں صرف اسقدر فرق تھا کہ عثمانی حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؑ سے افضل سمجھتے تھے، اور علویہ حضرت علیؑ کو ان سے بہتر جانتے تھے، شیخین کی فضیلت پر دونوں کو اتفاق تھا، لیکن رفتہ رفتہ عثمانیہ

نا صبیہ ہو گئے یعنی حضرت علیؑ کو علی الاعلان نعوذ باللہ گالیان دینے لگے، الاحوالہ اسکا رد عمل ہونا ضرور تھا، علویہ نے نہ صرف بنو امیہ کو بلکہ خلفائے اولین کو بھی بُرا کہتا شروع کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علویہ کا یہ فعل بہت بعد شروع ہوا، کیونکہ صحاح کی کتابوں میں بنو امیہ کی ان شرارتوں، اور خوارج کی بدعتیں کیوں کی تردید صحابہ کی زبان سے مفسر مذکور ہے، لیکن علویہ کی نسبت ان کا کوئی حرج میری نظر سے نہیں گذرا،

ہم نے لکھا ہے کہ ان سیاسی اختلافات نے مذہبی اختلافات کی بنیاد قائم کی، سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ جو لوگ جنگِ جمل و صفین وغیرہ میں ادھر یا ادھر سے شریک ہوئے اور ان میں برسرِ حق کون تھا، اور آیا دوسرا فریق اس آیت کا مستحق ہی یا نہیں،

وَمَنْ يَقْتُلْ مَوْجِدًا مَّتَّعِدًا بَإِذْنِ اللَّهِ  
جَوْسِیْ سَلَامَانَ كَوْعَدًا قَتْلَ كَرَسِیْ كَادِیْ جَزَا جَنَمِیْ  
جہنم خالداً فیہا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا،

یہ اختلاف سب سے پہلے کوفہ میں پیش آیا، اور یہیں سے یہ صدا بلند ہوئی، صحابہ زندہ تھے، سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ کے پاس آئے، اور پوچھا کہ یہ آیت منسوخ ہے، فرمایا نہیں، یہ آخری آیتوں میں ہے، (مسلم کتاب التفسیر) خوارج اس کے قائل تھے کہ چونکہ طوفان نے ایک دوسرے پر جان بوجھ کر تلوار اٹھائی اسلئے دونوں جہنمی ہیں، چنانچہ اسی اصول کی بنا پر ان تمام خانہ جنگیوں میں وہ دونوں جماعتوں کو براہِ رکاکا فر جانتے تھے، اور چونکہ قتلِ عمد گناہِ کبیرہ ہے اور اسکے لئے خدا نے دہائی جہنم کی دہلی دی ہے، جو کافروں کی سزا ہے اس سے وہ ثابت کرتے تھے کہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب مومن نہیں ہیں، یہ آیت بظاہر خوارج کے اثبات مدعین ایسی صاف تھی کہ خوارج اپنے خیالات کی اشاعت میں اس کا مایاب ہوتے تھے، مسلم میں روایت ہے کہ چند تابعین خوارج کے دلائل سے معقول ہو کر خارجی بن گئے

اتفاق سے حج کا زمانہ پیش آیا اور انکا مدینہ میں گذر ہوا، مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبد اللہ ایک مشہور صحابی اپنے حلقہ کو درس دے رہے تھے، اون لوگوں نے اپنے ٹکڑوں کے سامنے پیش کیے، اونھوں نے تشفی کر دی، اور ایک کے سوا سب لوگوں نے اپنی سابق رائے سے توبہ کر لی،

دوسرے فرقوں کے سامنے قرآن مجید کی دوسری آیت تھی،

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا أَیْنَمَا فَانَّ  
اَبَقْتُ أَحَدَهُمَا عَلَى الْاُخْرٰی  
اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم کشت و خون  
کرین تو اون کے درمیان صلح کرادو، اور  
اگر اون میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے  
تو ظالم جماعت سے لڑو یہاں تک کہ وہ حکم الہی کی  
اَمْرِ اللّٰهِ (حجرات) طرف رجوع کرے،

علوی اور عثمانی دونوں اس آیت کو اپنے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے  
تھے، وہ خود کو برسر حق ٹھہرا کر دوسرے فرقہ کو برسر باطل قرار دیتے تھے، اور اس لئے  
اوس پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتے تھے،

(۴)

اتنے تو بر تو پر دونوں کے اونٹنے کے بعد، اب، اب وقت آیا ہے کہ اہل سنت و الجماعہ  
کی حقیقت پر غور کیا جائے،

فقہ عثمانی ذی النورین سے لیکر اس وقت تک تین فرقے برابر برابر کے قائم ہو گئے  
تھے، علویہ، عثمانیہ، حروریہ، یا خوارج، انکی تعداد تمام ملک میں محدود تھی، یہ تینوں فرقے  
جس اصل غلط، جس میں مسقیم، جس شائبہ قدیم کو چھوڑ کر الگ الگ ستون پر پڑے تھے،

اسی کا نام "سنت" اور اسی کا نام "جماعت" تھا اور جو سواد اعظم اس راہ پر قدم زن تھا وہی "اہل السنۃ والجماعۃ" تھے، جو ایک طرف مذہبی حیثیت سے ان اصول سے جن کی شائع نے تعلیم کی تھی ایک ذرہ ہٹنا نہیں چاہتے تھے، دوسری طرف سیاسی نقطہ سے عامہ صحابہ، سواد اعظم، جمہور اور جماعت کی رائے کے پابند تھے، ان تمام خانہ جنگیوں میں کچھ لوگ میزبانی کے ساتھ تھے وہ عثمانیہ تھے، کچھ جناب علی مرتضیٰ کے ساتھ تھے وہ علویہ تھے، اور کچھ دونوں کو برا جانتے تھے وہ حروری اور خوارج تھے، "اہل السنۃ" وہ تھے جو دونوں میں سے کسی فریق کو برا نہیں جانتے تھے، اور اول کی اصل نیت پر حملہ نہیں کرتے تھے، ان کی حیثیت ان تمام خانہ جنگیوں میں ناظرندار جماعت کی تھی، اسلئے "اہل السنۃ" کسی فریق کے طرفدار گردہ کا نام نہ تھا، بلکہ ناظرندار گردہ کا نام تھا، وہ ان خانہ جنگیوں کو مذہبی جنگ نہیں بلکہ سیاسی جنگ سمجھتے تھے، وہ اسکو فتنہ کہتے تھے، اور اس کی شرکت پر عدم شرکت کو ترجیح دیتے تھے،

صحابہ کبار میں سے ان خانہ جنگیوں کے عہد میں ہزاروں صحابہ زندہ تھے، لیکن فریق کی حیثیت سے جن کا نام پیش کیا جاسکتا ہے وہ معدودے چند اشخاص تھے، بقیہ سواد اعظم ناظرنداری کی حالت میں تھا، جو بعض اشخاص فریق کی حیثیت سے ادھر یا اُدھر شریک تھے وہ ایک دوسرے کو نوذبانند فاسق یا کافر نہیں سمجھتے تھے، حضرت عمار بن یاسر حضرت علی مرتضیٰ کے سخت طرفدار تھے، وہ حضرت عائشہؓ کی قویٰ کے مقابل میں اہل کوفہ کو شرکت جنگ کے لئے ابھارتے ہیں تو یہ الفاظ اول کی زبان سے نکلتے ہیں،

اتى الا علم انھا لم توجتہ فی الدنیا  
والاخرۃ و لکن اللہ ابتلاکم  
میں جانتا ہوں کہ وہ دنیا میں آپ کی بیوی عقیقہ اور آخرت  
میں بھی آپ کی بیوی رہے گی یعنی عقیقہ میں لیکن خدا تم کو آزمائے گا

کہ اذکذا ساتھ دیتے ہو یا الٹا دیتے ہو،

المسبحوا لا وایاھا،

حضرت زبیر کے قاتل نے جب حضرت زبیر کا سر مبارک حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا قاتل ابن صفیہ کے لئے جہنم کی بشارت ہو، ہم ہی وہ ہیں جن کی شان میں خدا نے فرمایا ہے،

وَسَوْعَتًا مَّا فِي صُدُورِهِمْ  
مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ  
مُتَقَابِلِينَ،  
ان (اہل جنت) کے سینوں کی عداوت میں ہنسنے دور  
کردین اور وہ جنت میں بھائی بھائی بکر آٹنے ساٹنے  
تخت پر بیٹھے ہوں گے،

امیر معاویہ کو حضرت علیؑ سے جہتد سیاسی مخالفت تھی وہ پوشیدہ نہیں، لیکن جب علیؑ دینی ضرورت پیش آئی تو اُن کو اسی بارگاہ کی طرف رجوع کرنا پڑا، حضرت عائشہؓ حضرت علیؑ کے مقابل فوج لائی تھیں، لیکن دینی ضرورتوں کے موقع پر انھوں نے بھی حضرت امیرؓ کے پاس سے انکار نہ کیا،

بہر حال ان روایتوں سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ان بعض معدود صحابہ میں جو اختلاف تھا، وہ فرقہ بندی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اختلاف رائے کی حیثیت رکھتا تھا، اس بنا پر سواد اعظم نے ان خانہ جنگیوں کو خطا، اجتہاد ہی سے تعبیر کیا، قرآن کی جو چند اوپر نیچے کی آیتیں غلو یہ اور عثمانیہ ہلکوسنا کر رہ گئے تھے وہ پوری آیتیں ہلکوسناتے ہیں،

وَلَا تَكِلْ الْأَمْرَ إِلَى الْأَحْزَانِ مِنْهُمْ  
فَاَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بُعِثَ أَحَدُهُمَا  
عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى  
تَقِي إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاتَتْ فَاصْلَحُوا  
اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑیں تو ان کے درمیان  
صلح کرو اور اگر ایک نے دوسرے کو ظلم کرے اس سے لڑو  
بہا تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے تو  
اون میں صلح کرو،

سہ طبری، سہ سنن سعید بن منصور، سہ مسلم، المسح علی الخفین،

بَيْنَهُمَا، إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ  
 اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَكُمْ  
 خد اہل انصاف کو دوست رکھتا ہے،  
 مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے  
 دو بھائیوں کے درمیان صلح کرو اور خدا سے ڈرو  
 تَوَحَّحُوا، تاکہ تیسرے پر رحم کیا جائے،

وہ صحابہ جو ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے، اسلام کی تباہی پر انکے پر درد  
 کلمات، اور زمانہ فتن کے متعلق آنحضرت صلعم کے اقوال اور نصائح جس حسرت اور  
 افسوس کے ساتھ بیان کرتے تھے، اب تک ان کے پڑھنے سے آنکھیں اشک آلود ہو جاتی  
 ہیں، فاتح ایران حضرت سعد وقاصؓ خانہ نشین ہو گئے تھے، اور کہتے تھے کہ اگر میرے گھر  
 آکر بھی کوئی مجھے تلوار چلائے تو میں اپنا ہاتھ اس پر نہ اٹھاؤں گا، سہل بن صیفؓ سے  
 عدم شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو کہاتین نے جب اپنی تلوار میان سے نکال کر کندھے پر  
 رکھی ہو تو دفعۃً تمام مشکلیں حل ہو گئی ہیں، لیکن موجودہ مشکلات کی نسبت میں نہیں جانتا کہ  
 کیا کروں؟ حضرت علیؓ نے ایک بزرگ سے شرکت کی درخواست کی انھوں نے  
 عرض کی: میرے دوست اور آپ کے چچیرے بھائی یعنی رسول اللہ صلعم نے مجھ سے  
 کہا جو کہ جب ایسا وقت آئے تو لکڑی کی تلوار رکھنا، سو وہ لکڑی کی تلوار لیکر چل سکتا ہوں  
 حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابو بکرؓ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ وہ زمانہ ہی جس میں  
 سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے، کھڑا ہونے والا چلنے  
 والے سے، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہے۔

چند ایسے صحابہ بھی تھے جو اس زمانہ میں گھردن کو چھوڑ کر گاؤں، ورہاڑوں  
 میں چلے گئے تھے، ایسے بھی تھے جو اپنی رائے کے مطابق ادھر یا ادھر فوج میں موجود تھے۔

لیکن اوتھون نے تم کو انہیں چلائی، احادیث کے ابواب الفتن کو دیکھو تو اس قسم کے واقعات صفحہ صفحہ پر ملین گے،

(۵)

در راہ عشق پیر و پیشینان نہ ایم  
این شیوہ را بطرز دگر می کنیم ما  
گذشتہ نمبر میں "اہل السنۃ والجماعۃ" کی جو تعبیر کی گئی تھی، وہ سیاسی فرقوں کے مقابلہ میں تھی، لیکن حالات انقلاب سے یہی لفظ ایک اور معنی پیدا کرتا ہے، جس کو ہم لفظ "اہل السنۃ والجماعۃ" کا دوسرا دور کہتے ہیں،

اس دوسرے دور کی تشریح کے لئے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے، جس طرح اشخاص کے فطری خصائص اور اخلاق ہوتے ہیں، اسی طرح قوموں کی بھی فطری خصوصیتیں اور ادن کے طبعی اخلاق ہیں، عرب کی قوم نظرۃ سر تا پا اعلیٰ ہے، ایران سر تا پا خیال اور تخیل ہے، جن لوگوں کی نظر علم کلام کی تاریخ پر ہو وہ جانتے ہیں کہ جب تک عربوں کا ایرانیوں کے ساتھ اختلاط نہیں ہوا، عربوں کے ہر قسم کے قوائے علمی زندہ تھے، انحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی تقلید و متابعت منع فرمایا تھا، اس کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کے قوائے اخلاقی، اسلامیات اور عرویت کے صحیح نمونہ پر قائم رہیں، حضرت عمرؓ نے مسلمان سپاہیوں کو ایران کی مہم پر روانہ کیا تھا تو ان کو نصیحت کی تھی کہ ایرانیوں سے آرام طلبی کی تعلیم نہ حاصل کریں، غیر قوموں کو مسلمانوں کے تشبہ اور ادن کے طرز لباس کی تقلید سے بھی اسلئے روکا کہ اسلامیات کا جوہر اس اختلاط اور قسب سے برباد نہ ہو جائے،

فتح ایران کے بعد عرب و عجم کے حدود پر فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر کوفہ اور بصرہ کے شہر آباد ہوئے، تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر



عرب و عجم کے غیر مرئی اخلاق و خصائص کے نمایاں گاہ بن گئے، ان اطراف میں اسلام کے پہلے سے بھی پارسیوں کے وہ فرقے جن کا مذہب سرکاری مذہب کے موافق نہ تھا، اور مجوسیوں کے باطل ذقے شمار ہوتے تھے، آباد تھے، چونکہ یہ حکومت ایران کی آخری سرحد تھی اسلئے ان مذہبی مجرموں کے لئے اس سے بہتر کوئی ماں نہ تھا، عربوں نے فوجی نقطہ نگاہ سے ان مقامات کو اپنا فوجی مرکز قرار دیا،

عرب کی خشک آب و ہوا میں رنگین طبیعتوں کی پرورش کے لئے عراق کے ہزاروں درجہ و جملہ وفرات کے کناروں سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، ان وجہ سے اس زمانہ میں یہ شہر علم و مذہب اور ادب و تمدن کی دھچپیوں کے باغ و بہار تھے، لیکن عرب و عجم کے رنگ و مذاق میں جو طبعی اختلاف ہو، اس کے ابھرنے کے لئے بھی اس سے بہتر زمین کا کوئی قطعہ نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ و عمل کی فوجی سرزمین ادھام و خیال کی زر مگاہ بن گئی،

لوگ کہتے ہیں کہ رات کو بیمار سی کی شدت بڑھ جاتی ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بیمار سی کی شدت نہیں، بلکہ بیمار کے احساس کی شدت بڑھ جاتی ہو، دن کے شور و غل اور حواس کی مصروفیت میں احساس کا کم موقع ملتا ہو، لیکن رات کے خاموش اور غیر مصروف گمنون من ہاں سے احساسات ایک ایک رونگٹے کو ٹٹولتے ہیں، اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں،

امام حسنؑ اور امیر معاویہؓ نے جب باہم صلح کر لی، اور لوگوں کو اطمینان سے غور کا موقع ملا، تو ہر گروہ کو اپنے بدن کے زخم جن کے دیکھنے کی پہلے فرصت نہ تھی محسوس ہونے لگے، دن کے شور و غل اور حواس کی غافلانہ مصروفیت کے بعد اب شام ہو رہی تھی اور رات کے گھٹنے آ رہے تھے، عمل کا دور ختم ہو کر اب تحلیل کا دور شروع ہوتا ہو، سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا اور یہ کوفہ سے پیہ ہوا، ہم اگر حق پرستے تو دوسرے فریق کی نسبت ہم کیا خیال کریں، اور اگر حق پرستے

تو ہم خود مذہبی عدالت میں کیا ٹھہرتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے،

مَنْ قَتَلَ مَوْسًا مَثْعَمًا ابْنُ حَزْرًا  
جس نے کسی مسلمان کو عمدہ قتل کیا اوس کی جزا

خالد ایضاً، جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا،

اس بنا پر عثمانیہ اور طرفداران معاویہ اپنے کو برسر حق سمجھ کر دوسرے کو جہنمی قرار دینے

تھے، غلو یہ بھی اپنے مخالفین کی نسبت یہی فیصلہ کرتے تھے، خوارج نے کہا کہ دونوں نے

جان بوجھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائی، اسلئے دونوں جہنمی ہیں، اہل السنۃ کا فیصلہ یہ تھا

کہ یہ قتل عمد نہیں، قتل شہید ہے، کہ ہر ایک فریق اپنے کو برسر حق جان کر اور دوسرے کو برسر باطل

سمجھ کر نہ بنا اور اعتقاداً دوسرے کا خون بہانا جائز اور مباح سمجھتا تھا، اسلئے اس کا فیصلہ اوس کے

ہاتھ ہے جو حقیقت حال سے واقف، اور نیتوں کے اصل نشانے آگاہ ہے،

بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ کوفہ سے چند لوگ حضرت ابن عباسؓ کی خدمت

میں آئے اور اون سے پوچھا کہ یہ آیت منسوخ ہے، فرمایا نہیں، یہ آیت آخر میں اتری ہے،

اس کو کسی نے منسوخ نہیں کیا، مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، قرآن میں تو یہ ہے کہ

ہم مسلمانان اول کے لئے دعائے مغفرت کریں، لیکن لوگ اون کو گالیان دیتے ہیں، ام المومنین

اس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے،

رَبِّكَ اغْفِرْ لَنَا وَلَا تَلْزِمْنَا الَّذِينَ  
خداوند اہم کو اور ہمارے اون بھائیوں کو جو

اسلئے یہ فیصلہ بحیثیت خارجہ جکیوں کہ ہے، ورنہ مناقب و فضائل کے لحاظ سے حضرت علیؓ کا جو پایہ ہے وہ انہرمیں الشمسؓ کے

مقابلہ میں امیر معاویہ وغیرہ کا نام لینا، ذرہ کو آفتاب کے برابر کرنا ہے، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی ترتیب فضیلت کے

باب میں گو اب جمہور اہل السنۃ کا یہی مسلک ہے کہ حضرت علیؓ کا درجہ حضرت عثمانؓ کے بعد ہے، لیکن قدائے اہل السنۃ اس

مسئلہ میں مختلف رائے ہیں، ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں سیبوں وغیرہ کے نام لکھے ہیں جو حضرت علیؓ کی تفضیل کے قائل ہیں،

سَبَقُوا نَارًا لَا يُخْمَرُونَ،

ایمان میں جم سے پہلے میں معاف کر

یہ حدیث بخاری اور مسلم کی کتاب التفسیر میں ہیں، سلف صالحین اور محدثین اہل سنت

اصولی حیثیت سے اس مسئلہ کو ذکر کیا، چنانچہ عقائد کی تمام کتابوں میں اس کا ذکر ہوا،

**خوارج کے نزدیک چونکہ یہ قتلِ عمد تھا جو گناہ کبیرہ ہے اور جس سے دہائی جہنم کا**

انسان مستوجب ہوتا ہے، اور دہائی جہنم کا مستوجب ہونا صرف کافروں کی صفت ہے، اسلئے

گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوگا، اس نتیجہ نے خارجی مذہب کے اصول اولین کی حیثیت اختیار کر لی،

اس کے بالمقابل ایک اور فرقہ ہوا جو **صلیہ** کے نام سے مشہور ہوا، اس نے بعض احادیث کی

بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں گناہ سے مومن کسی طرح عذاب کا

مستحق نہیں ہوتا ہے چہ جائیکہ اس سے کفر لازم آئے، ایک تیسرا فرقہ معتزلہ کا ان

دونوں کے بیچ میں پیدا ہوا جس نے دونوں گزشتہ فریقوں کے دلائل منکر یہ فیصلہ کیا کہ

گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہو نہ کافر ہے، وہ کفر اور ایمان کے بیچ کی منزل میں ہے،

**اہل السنۃ** پھر آگے بڑھتے ہیں وہ ان فرقوں کی طرح جو صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے

صرف ایک دو آیت یا حدیث کو لیکر فیصلہ نہیں کرتے، ان کے سامنے قرآن کی تمام آیتیں

تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ہدایات تھیں، صحابہ کے آثار اور روایات تھیں، انہوں نے

کہا، گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کفر لازم نہیں آتا، لیکن عذاب کا مستحق ضرور ہوتا ہے، ممکن ہے

کہ خداوند تعالیٰ اپنی قدرت اور رحمت سے گنہگار کی خطاؤں کو معاف کر دے اور اسے

عذاب سے بچائے، صحیح مسلم میں ہے کہ بعض لوگ خوارج کے دلائل منکر خارجی بن گئے، اتفاق سے

ان کا گزردنہ میں ہوا، وہاں حضرت جابر سے ملاقات ہوئی، ان سے پوچھا کہ گناہ کبیرہ بھی

جائیگے، انہوں نے قیامت کے تمام واقعات اور گنہگاروں کی شفاعت اور مغفرت بھی

حدیث بیان کی یہ سنکر ایک کے سوا سب تائب ہو گئے،  
 ہم نے پہلے نمبر میں لکھا ہے کہ ان فرقوں نے قومی تقسیم کے علاوہ ملی تقسیم بھی حاصل کر لی تھی،  
 شام میں غسانی و ناصبی وغیرہ، امیان بنی امیہ تھے، اور عراق میں علوی اور اہل عجم تھے،  
 بنو امیہ نے میدان کر بلا میں جگر گوشہ رسول کے ساتھ جو کچھ کیا، سرزمین حرم میں نواسہ  
 صدیق (ابن زبیر) کو جس بیدروسی کے ساتھ قتل کیا، امام زین العابدین کے ولند زید  
 شہید کا جس طرح آتار گیا، ہدیۃ الرسول میں انصار کرام جو رسول کے دست و بازو تھے، انکو  
 جس سفاکی سے تہ تیغ کیا، پھر صحرہ کے خدین و رعلا کا خون جس طرح میدیغ بہایا او کو دیکھ دیکھ کر اور سن سکر تمام صحابہ سلامتی  
 دم بخود تھا،

تلوار کا جادو زبان کو گونگا کر سکتا تھا لیکن دل کا کاٹا نہیں نکال سکتا تھا اسکے لئے مذہبی منتر کی  
 ضرورت تھی، آخر وہ منتر بنو امیہ کو مل گیا، اور وہ مسئلہ جبر تھا، یعنی یہ کہ انسان مجبور محض ہے جو کچھ  
 کرتا ہے خدا کرتا ہے، اسلئے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں، اسکی ذمہ داری خدا پر عاید ہے،  
 ان وجہ سے ان سفاکیوں کے وہ مجرم نہیں بلکہ نعوذ باللہ خود خدا مجرم ہے،  
 اس کے مقابل تم خود فیصلہ کر سکتے ہو کہ عراق کے مذہبی جادو گروں نے اہل شام کے  
 پس منتر کو کیونکر کامیاب کیا، وہ نظریہ قدر ہے یعنی یہ کہ انسان اپنے تمام اعمال کا آپ ذمہ دار  
 ہے، تقدیر کوئی شے نہیں، خدا نے اس کے افعال پر اس کو قدرت دے رکھی ہے،  
 انسان خود جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے، یہ آواز سب سے پہلے عراق سے اٹھی، اور  
 سنسویہ یاسوسن نام ایک عجمی نژاد کی زبان سے بلند ہوئی، مسجد نبوی، مسجد نبوی نے اہل کواصل عقائد میں  
 ۱۔ تقریبی جلد، صفحہ ۳۵۶، مصر، ۲۔ مجمع مسلم کتاب الایمان و تہذیب باب ما جاز فی القدر، ۳۔ کتاب الصفات  
 بیہقی و خلق افعال العباد بخاری ص ۲۷ طبع دہلی،

داخل کر دیا، کچھ لوگ بصرہ سے حضرت ابن عمرؓ کے پاس آئے اور عرض کی کہ ”ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے ہیں جو تقدیر کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام کام پہلے سے مقدّر ہو کر نہیں بلکہ سر تو ہوتے ہیں، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ”ادن کو کہہ دو کہ ہم کو ادن سے تعلق نہیں اور ادن کو ہم سے نہیں“، معبد جتنی مسئلہ قدر کو بصرہ کے علمی حلقوں تک پہنچایا، اور پھر رفتہ رفتہ اسکا دائرہ وسیع ہوتا گیا،

معبد اور عطاء بن یسار حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں آتے اور عرض کرتے کہ ”یہ لوگ (بنو امیہ) خلق خدا کا خون بہاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ خدا کے حکم اور تقدیر سے کرتے ہیں“، انھوں نے کہا ”خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں“ آخر معبد نے بغاوت کی اور عبد الملک امویؒ کے حکم سے قتل ہوا، معبد کے بعد عمرو ابن عبیدہ، جعد بن درہم، اور غیلان دمشقی وغیرہ نے اس آواز کو دہن نہ دیا، اور یہ سب یکے بعد دیگرے بنو امیہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے، ان کے قتل نے اس فرقہ میں اور زیادہ جوش برپا کر دیا، اور ایک دوسرا اصول ان میں مسلم ہوا کہ سفاکوں اور ظالموں کو ٹوٹنا اور عدل و انصاف کی دعوت دینا فرض ہے، ابتداً اس فرقہ کا نام قدیم پڑا اور آخر بڑھتے بڑھتے یہی معتزلہ بن گیا،

اب وہ وقت آ گیا کہ امویہ کا دور گزر کر عباسیہ کا ستارہ اقبال سیاہ چھپون کے سایہ میں ایران کی سرزمین سے طلوع ہوا، یونان و عجم کے فلسفہ نے زبانوں کی گرہیں کھول دیں، جس کے منہ سے جو بات نکلی وہ ایک مذہب بن گئی، عراق، خراسان، رے وغیرہ ایران کے بڑے بڑے شہر مذہب ساز یونان اور فرقہ بندیوں کے

مرکز بن گئے، خراسان میں ہم بن صفوان ترذی پیدا ہو جس نے تمام صفات الہیہ کا انکار کیا، اور خدا کو مجبور محض فرض کیا، معتزلہ نے خدا کو صفات سے اس قدر منزہ کیا کہ وہ معدوم کے ہم منہی بن گیا، ابن کرام سیستانی نے سب سے میں خدا کی تجسیم کا وہ اعتقاد ظاہر کیا کہ ایک خوبصورت اور ثقہ صورت انسان بنا کر تخت پر بٹھادیا، معتقدین تجسیم بھی ایک خیال پر متفق نہ ہوئے، خراسان میں سلیمان مفسر نے یہ اعتقاد ظاہر کیا کہ خدا کا جسم گوشت اور پوست سے مرکب ہے، ہشام بن حکم نے گوشت پوست کے بجائے اوس کو نورانی اجسم کہا، ہشام بن سالم جو لقمی نے کہا خدا نور ہے، گوشت پوست نہیں، اور کا دھڑخوف اور نیچے کا دھڑھٹوس ہے، اوس کے کالے کالے بال ہیں، انسانوں کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے، اوس کے ہاتھ پاؤں ہیں، منہ ہے، ناک ہے، داڑھی نہیں، بیان بن سمعان نے کہا خدا کے جسم تو سہے لیکن وہ قیامت میں فنا ہو جائے گا، صرف چہرہ رہ جائیگا، معتزلہ نے خدا کی رویت کا انکار کیا، اکثر نے تسلیم کیا دوسروں نے کہا رویت ان حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ایک اور حاسہ سے ہوگی جو قیامت میں خدا پیدا کرے گا،

یہ بحث تو صرف خدا کی ترکیب کے لحاظ تھی، خدا کے صفات کی بحث اس کے بعد شروع ہوتی ہے، جہمییہ نے خدا کے صفات الہیہ سے انکار کیا کہ اگر صفات ہوں تو اون کی بقا بھی لازم آتی ہے، اور الہی بقا صرف خدا کی ذات کو ہے، نیز اگر صفات لگ ہوں، ذات ہوتا ہے مگر الہی ترکیب لازم آتی ہے، اور وہ ترکیب سے پاک ہے، معتزلہ نے کہا خدا کی عین بسیط ذات ہی صفات کی قائم مقام ہے، اس کے مقابل طور اس نے کہا صفات ذات سے الگ مستقل منہی رکھتی ہیں، اشاعرہ نے کہا کہ صفات نہ عین ذات ہیں نہ خارج از ذات ہیں، کبھی غبی نے کہا کہ خدا میں صرف ایک صفت علم ہے، ارادہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے،

ایمان اور عمل ایک شے ہے یا عمل ایمان سے خارج ہے، ایمان زبان سے صرف اقرار کا نام ہے، یا دل سے محض اعتقاد کا، یا زبان کے اقرار اور دل کے اعتقاد دونوں کے مجموعہ کا، ایمان میں کمی زیادتی ہو سکتی ہے یا نہیں، خدا پر ایمان لانا عقلاً واجب ہے، یا سمعاً، نبوت کا ثبوت عقل سے ہوتا ہے یا نقل سے، معجزہ ممکن ہے؟، معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں، معجزہ مخفی اسباب پر مبنی ہوتا ہے؟ خدا کے احکام میں مصلح اور حکم ہوتے ہیں، خدا کے کام اسباب کے زیر اثر ہیں؟ قرآن معجزہ ہے یا نہیں، قرآن کا جواب وحیقت نہیں ہو سکتا تھا یا ہو سکتا تھا، لیکن خدا نے انسان سے اس کی قدرت سلب کر لی ہے، قرآن اگر معجزہ ہے تو کس حیثیت سے پیشینگی کی حیثیت سے یا عبارت کی حیثیت سے، قرآن کیونکر کلام الہی ہے، وہ قدیم ہے یا حادث؟ اس کے الفاظ بھی قدیم ہیں، یا صرف معانی، جنت اور دوزخ کا وجود حقیقت میں بھی ہے یا اس سے مجازی معنی مراد ہیں، اگر حقیقی مراد ہیں تو اس وقت موجود ہیں یا نہیں، قیامت میں وہ مینگی یا فنا کر دی جائیگی، جس کے دل میں ذرا بھی ایمان ہو گا وہ دوزخ میں داخل ہو گا یا نہیں، قبر میں بندہ پر عذاب ہوتا ہے یا نہیں، دوزخ میں کفار سب ایک بار حلین گئے یا بار بار، خدا کو محال پر قدرت ہے یا نہیں؟ وہ ظلم کر سکتا ہے یا نہیں، اور آخر یہ کہ نعوذ باللہ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟

امامت کا سلسلہ ہم نے چھیڑا نہیں کہ اس سے پھر ایک اور تسلسل پیدا ہو گا۔ یہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں مخرقات مسائل کی صورت میں پیدا ہوئے اور جس کی عقل نے جوابات کہی وہ ایک گروہ کا مذہب قرار پا گئی، چنانچہ یہ تمام مسائل مختلف فرقوں میں نفی یا اثباتاً اصول مذہب میں داخل ہیں، یہ اختلافات صرف زبان اور دلائل تک محدود نہ رہے، بلکہ بارہا دست و گریبان تک فوجت پہنچی، تیسری صدی میں

اشعریت پیدا ہوئی جس نے محدثین اور نقما وین بھی حسن قبول پیدا کیا کہ اس کا مسلک عقل و نقل اور معتزلہ اور ظواہر کے بیچ بیچ میں تھا اس نے ایک طرف باقلانی، ابن خورک غزالی اور رازی کے زور بیان سے اور دوسری طرف ملک شاہ بلخوی، سلطان محمود غزنوی، سلطان صلاح الدین ایوبی، اور محمد بن تومرت موصدی (اسپین) کی تلواروں سے وہ قوت حاصل کی کہ تمام فرقے اس کے سامنے دب گئے، تاہم بغداد کی سرزمین جب تک شلوہ رہی، حنابلہ اور اشاعرہ جن میں سے ہر ایک کتاب و سنت پر عمل و ایمان کے تہاد و عویدار تھے، کبھی ان کے باہمی فتنوں سے خالی نہ رہی،

۶

اسلام کے مختلف فرقوں کی پوری روداد اب تمہارے سامنے ہے، غور سے پڑھو اور دیکھو کہ ان اختلافات کا اصلی منبہ اور اون کی پیدائش کے اصلی اسباب کیا تھے؟ یہ تھے کہ اسلام کی عملی زندگی کو چھوڑ کر صرف تخیل کی زندگی اونھوں نے بسر کرنی چاہی، اسلام میں اختلافات کی جو بنیاد پڑی جب تک ان میں عجمی عنصر غالب نہ ہوا وہ عمل اور زندگی کی جنگ تھی، وہ مذہب کی آمیزش بغیر خالص سیاسی اور پولیٹیکل جنگ رہی، جس کے فیصلے کئی بار غور سے چاہے گئے، جمیٹ کے عنصر نے پالیٹکس کو مذہب کے پرچے میں چھپا دیا اور تلوار کی جگہ شکوک، شبہات، استدالات عام فریب، تاویل فاسد، تفسیر عقاید نے لے لی، نتیجہ یہ ہوا کہ تلوار کی جنگ گونا گویا اجسام کو فنا کر رہی تھی، لیکن قوی زندگی کی روح کو نہیں فنا کر رہی تھی، قوم میں زندہ رہنے کا جو پیش و خردش بہت، لیکن خیال آرائی کے اس طرز جنگ نے زندگی کے اصل جوہر مذہب کی اصل روح اور عمل کی اصلی قوت کو فنا کر دیا،



اسلام ہم دوسرے مذاہب کی طرح عقائد اور عبادات دو عنصر سے مرکب ہے اگر فرق یہ ہے کہ اسلام عقائد کی وسعت اور کثرت کا شائق نہیں بلکہ اس کے رسوم، ہتواری اور شدتِ اذعان کا طالب ہی، لیکن انسانیت کی بیمار فطرت ہمیشہ وسعت کی طرف جاتی ہی، خلاق فطرت کا فرستادہ اس رمز سے آگاہ تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

لن يبرح الناس تيساء لوان      لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے بحث و مناظرہ کرتے  
حتیٰ یقولوا هذا الله خالق      ہوئے یہاں تک پہنچے کہ اچھا خدا نے سب چیزوں کو  
کل شئی فمن خلق الله      پیدا کیا، پھر خدا کو کس نے پیدا کیا،

مسلم میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ نے آیت ذیل تلاوت فرمائی،

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ      اس نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی جس میں کچھ آیتیں  
آيَاتٍ تُحْكَمُ بِهُنَّ أَمْ الْكِتَابِ وَ      حکم اور واضح ہیں، وہ اصل کتاب ہے اور بعض متشابہ ہیں  
آخِرُ مُّشَابِهَاتٍ فَأَمَّا الَّذِينَ      جن کے دلوں میں کجی ہو وہ متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ہم  
رَفِئَ قُلُوبُهُمْ رَئِيعٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَاءُ      اُٹھانے اور اس کے مطلب کو حل کرنے کے لیے  
مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ      حالانکہ اسکا حقیقی مطلب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا،  
وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ      بعد جو لوگ علم میں کہے ہیں وہ کہتے ہیں، ہم اس پر  
فِي الْعِلْمِ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ أَمْثَابَ كُلِّ مِّنْ      ایمان لائے یہ سب خدا کی طرف سے ہیں اور عقل مندوں کے  
عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولَٰئِكَ      سوا کوئی عبرت نہیں پکڑتا،

پھر فرمایا،

اِذَا رَأَيْتُمُ النَّاسَ يَتَّبِعُونَ مَا  
تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ  
سَمَّى اللَّهُ فُلْحَنًا دَوَّهَمَ،  
 جب ان لوگوں کو دیکھو جو تشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں  
 تو جالو کہ یہ وہی ہیں جن کا خدا نے نام لیا ہے تو ان سے  
 احتراز کرو

اسی بنا پر صحابہ کرام سے اگر کبھی کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو اس ارشاد کے خلاف ہوتا  
 تو آپ سخت برہم ہوتے، تم ندی میں ابو ہریرہؓ سے اور ابن ماجہؓ میں عبد اللہ بن عمرؓ  
 سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ اصحاب ایک حلقہ مجلس  
 میں بیٹھے بحث و نزاع میں مشغول ہیں، فرمایا کہ کس مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہو یہ عرض کی  
 مسئلہ تقدیر میں، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا  
 کہ گویا کسی نے چہرہ مبارک پر انار کے دانے پھوڑ دیئے ہیں، آپ نے فرمایا کیا تم کو اسی کا  
 حکم دیا گیا ہے، کیا تم اسی لئے پیدا کیے گئے ہو، کیا میں یہی پیغام دیکر بھیجا گیا ہوں، قرآن  
 کی ایک آیت کو دوسری آیت پر چلتے ہو، تم سے پہلے جو توین تھیں وہ اسی سے ہلاک  
 ہوئیں، میں بتا کید کرتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام عقائد کی وسعت اور اون میں بحث و  
 نزاع کا شائق نہیں۔ وہ صرف اوس پیغام پر ایمان و یقین کا طالب ہے جو علی الاعلان  
 سے تمام دنیا کو سناتا ہے جس کے سمجھنے میں نہ عرب کے بدو دن اور افریقہ کے حبشیوں کو تامل  
 اور نہ یونان کے حکیموں اور یورپ کے فلاسفوں کو، بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ ایک  
 صاحب کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا تھا، وہ احمق سی کوئی حبشیہ آنحضرت صلعم کی خدمت  
 میں لائے اور دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے؟ آپ نے اوس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟  
 اوس نے آسمان کی طرف اونگھی اٹھا دی، آپ نے اون صاحب سے فرمایا لیا کہ یہ مسلمان ہے؟

اللہ اکبر! اسلام کی حقیقت پر کتنے پردے پڑ گئے ہیں، آپ اسلام کے لیے صرف آسمان کی طرف انگلی اٹھا دینا کافی سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک آج کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک فسفی کے تمام بندے ہوئے عقائد پر حرفاً حرفاً آمنت نہ کرتا جائے،

(۷)

جنگ ہفتاد و ملت ہمہ را عذر مبنہ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند  
پہلی دو نشستوں میں ہم یہ اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ مذہب کی اصلی اور حقیقی تصویر وہی ہے جو داعی مذہب کے علم و عمل اور اس کی تعلیم و تلقین کا صحیح اور ہو ہو عکس ہو، پیغمبر کی ضرورت ہم نے اسی لئے تسلیم کی ہے کہ عقل انسانی زندگی کی اصلی گریہوں کے کھولنے سے عاجز ہے، اسلئے رحمت الہی انسانیت کے ایک بلند ترین پیکر کو روح القدس کے توسط سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجتی ہے، وہ لوگوں کو ہر قسم کے تلقینات سے مشرف کرتا ہے، اون کو اون کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے تعلیمات دیتا ہے، لیکن، فوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں اور اس کی عملی زندگی کے لئے ان کا علم ضروری نہیں، ان کو وہ اسی طرح سر بستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، اور ان کے متعلق وہ صرف یہ سکھا جاتا ہے،

وَلَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا  
اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو علم میں راسخ اور پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے،

اس بنا پر اگر ہم ان اعتقادات اور تعلیمات پر جو پیغمبر نے انسانوں کے لئے ضروری سمجھے، اپنی عقل اور سمجھ سے کچھ اضافہ کرنا چاہتے، یا کچھ اس میں سے حذف کرنا یا بڑھانا

جاتے ہیں، یا جس گروہ کو جہان تک اس نے کھول کر چھوڑ دیا ہے، ہم اس کو اور کھولنا چاہتے ہیں تو حقیقت ہم اصل نبوت کے ثبوت کے دعویٰ کو کمزور کر رہے ہیں، اور عملاً ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی تکمیل کے لیے پنیمبر کی حاجت نہیں، بلکہ خود عقل انسانی ہماری رہبری کے لیے کافی ہے، حالانکہ اس کا بطلان ہمارے نزدیک بدیہی الثبوت ہو چکا ہے،

غور کرو کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کی عملی زندگی کے لیے وہ چراغ راہ ہے، انسان اور اس کی عملی زندگی کا تعلق تمام تراویات سے ہے، اسلئے ماورائے مادہ کی نسبت صرف وہیں تک اس کو تعلق ہے جہاں تک انسان کی عملی زندگی کے لیے ضروری ہے، ہم اپنے مقصود کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے ذرا تفصیل سے کام لیتے ہیں،

مذہب میں دو چیزیں ہوتی ہیں، عقائد اور عبادات (معاملات بھی) حقیقت عبادات ہیں، دوسرے الفاظ میں ان کی یہ تعبیر ہو سکتی ہے کہ مذہب علم اور عمل سے مرکب ہے،

علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ ہے، اور انہیں سے وابستہ ہے، اور اسکے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہدہ اور تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے، دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیل، تصور، اور ظن ہے، ”آگ جلاتی ہے“ یہ علم مادی ذریعہ احساس سے ہم کو حاصل ہوا ہے، اسلئے ہم کو اس وجہ یقین ہے کہ غلطی سے بھی ہم آگ میں کودنے کی ہمت نہیں کر سکتے لیکن سراسر علم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر دوسرا جنم لیتا ہے، لیکن اس علم پر اعتماد کر کے کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کر دینے پر تیار ہو گا؟

ہماری زندگی اسی عالم مادی سے متعلق رکھتی ہے، ہمارے اعمال اسی عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افراد انسانی کی کامیابی اور ناکامی، قوانین اور قوموں کی ترقی و تہذیب، عروج و زوال، انقلاب و تغیر غرض انسانیت کے جملہ مظاہر، اور عالم کا ہر نظام ترقی انہیں یقینیات اور علوم قطعیہ پر مبنی ہیں، چنانچہ ہمارے اس پرانے علم مسائل اور معلومات کے پیچھے پڑنا اور ان کی گرہ کشائی چاہنا جو مادہ رائے خواں ہیں، اور جن کے ساتھ ہمارا علم متعلق نہیں ہو سکتا ہمارے لیے بالکل بے سود ہے اور غیر مفید ہے۔

ہمارا فلسفہ جن کا تعلق مادہ رائے مادہ سے ہے، وہ علم ظنی ہے، سائنس کا اکثر حصہ ہمارا گذشتہ عجز و غرور اور مشاہدوں کی بنا پر ایک حد تک درجہ یقینی رکھتا ہے، اب دیکھ لو کہ دنیا میں دونوں میں سے کس کی ممنون ہے؟ فلسفہ کی یا سائنس کی؟

یونان کے سب سے پہلے فلسفی تالیس سے لیکر سقراط کے بعد تک ڈھائی ہزار برس میں فلسفہ دنیا کے لیے کیسا کارآمد ہوا لیکن سائنس نے دو تین سو برس کے اندر اندر عالم میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اس بنا پر غیر مادی اور غیر محسوس شیا کی نسبت یہ سوال کہ وہ کیا ہیں؟ اور کیوں نہیں؟ بالکل بے سود ہے، اور اس کی دلیل اس سوال کے حل میں انسانی نسلوں کی گذشتہ صدیوں اور قرون کی ناکامی ہے، اسلئے ہماری بحث صرف و فقط حقائق کا موضوع انقیاد یا اثباتاً، غیر محسوس شیا نہیں ہو سکتی،

یہی وہ نکتہ ہے جس کو یورپ نے اب سمجھا ہے، اور جس کو اسلام نے اپنے آغاز ظہور ہی میں واضح کشف کر دیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اہل السنۃ کے سوا اسلام کے اور فرقوں نے اس کو محفوظ نہیں رکھا، اور یہی آخر ان کی بے رائد روی کا سبب ہوا، اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو گا کہ اہل سنت کے مذہب کا مدار اور مبنی یہ دو اصول ہیں،

(۱) داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور اعمال کے متعلق اپنی امت کو جو کچھ تعلیم و تلقین کی اوس میں ایک ذرہ زیادتی یا کمی نہیں ہو سکتی،

(۲) عقائد یا خدا کی ذات اور صفات کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا یا آپ نے جو کچھ بتایا، اور جس سلسلہ کی جس حد تک قرآن نے تشریح کی، صرف اُسی پر ایمان لانا واجب ہے اپنی عقل و قیاس و استنباط سے اوس کی تشریح و تفسیر صحیح نہیں، اور نہ اس پر ایمان لانا اسلام کی صحت کے لئے ضروری ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا موجب ہو، اسلام کے تمام فرقے اگر ان دو اصولوں پر قائم رہتے، تو یقیناً عقائد کے وہ عظیم نشان

اختلافات رونما نہوتے، جس کے سیلاب نے ایک مدت مدید سے کاشانۂ اسلام کے ارکان متزلزل کر رکھے ہیں، خوب غور کرو، گزشتہ مباحث میں مختلف فرقوں کے جو مسائل اور معتقدات گنائے ہیں، ان کی گمراہی کا سبب صرف یہی ہے، کہ انھوں نے ان امور کی تفصیل چاہی جن سے قرآن خاموش تھا اور جن کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری نہیں تھی، کہ اول تو وہ اُن اسرار سرستہ اور عقیدہ اسے شکل میں نہ دیکھیں جن کی تحلیل عقل انسانی کے فہم و ادراک سے باہر ہے، اور ثانیاً یہ کہ انسان کی عقلی زندگی کے لئے ان کا علم بے سود ہے،

- شریعت نے خدا کے متعلق یہ بتایا کہ وہ ایک ہے، ہمیشہ سے ہی اور ہمیشہ ہوگا، وہ تمام صفاتوں کا مرکز ہے، اس کے بعد یہ بحث کہ وہ ایک کس حیثیت سے، صفات کی مختلف قسمیں ہیں، کون سی صفات اوس میں پائی جاتی ہیں، یہ صفات اوس کی ذات میں داخل ہیں یا اوس کی ذات سے الگ ہیں، اگر الگ ہیں تو قدیم ہیں یا حادث، اگر قدیم ہیں تو تعدد و قدم لازم آتا ہے، حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ہے، اگر حادث ہے تو تعدد و قدم لازم آتا ہے،

اور نسل حادث خود حادث ہوتا ہے، اگر الگ نہیں بلکہ ذات میں داخل ہیں تو ذات کا جز ہو کر یا نکل ہو کر، اگر ذات کا جز ہے تو خدا کی ترکیب لازم آتی ہے، اور اگر نکل ہے، تو عین ذات ہوگی، اس لحاظ سے اس کی ذات اور صفات میں سے ایک کی نفی لازم آئیگی، علم، قدرت، شمع، بصر، ارادہ وغیرہ مختلف صفات مختلف نہیں، بلکہ متحد ہو جائیگی، خدا کی نسبت ہاتھ، پاؤں، منہ اور قدم کے الفاظ کتاب و سنت میں آئے ہیں، ان سے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی، خدا کی نسبت قرآن میں ہے کہ وہ عرش پر برابر ہے، اور یہ بھی ہے کہ بعد مخرج کر دے اور ہر ہی خدا کا منہ ہے، یہ بھی ہے کہ وہ تھامی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے، تو آیا وہ کسی خاص جگہ میں ہے یا جگہ سے مبرا ہے، پہلی صورت میں اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے، اور دوسری صورت میں ایک خاص موجود ذات کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہر جگہ ہے ایک سنجیدہ حماقت ہے،

احادیث صحیحہ میں ہے کہ قیامت میں خدا نیک بندوں کو نظر آئیگا، اگر یہ تسلیم کر لیں تو لازم آئیگا کہ وہ جسم ہو کسی خاص جگہ میں ہو، اور اگر نظر آنا تسلیم کریں تو انھیں آنکھوں سے وہ رویت ہوگی، یا کسی اور جدید حاسہ سے، ان آنکھوں سے نظر آنا خدا کے لئے جسم، رنگ، تحدید، تقسین وغیرہ کو مستلزم اور آخری صورت میں موجودہ ذرائع احساس کے علاوہ کسی اور ذریعہ احساس کا اعتقاد فہم سے بالاتر ہے،

شریعت میں اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو پیدا کیا، اور وہ اس کا مخلوق ہے، اس کے بعد یہ مباحث کہ خداوند تعالیٰ اس کی علت کامل یا ناقص ہے، اگر علت ناقص یعنی غیر تامہ ہے تو عالم کی خالقیت کے لئے کسی اور شے کی شرکت بھی لازم آتی ہے،

لَهُ الْوَحْدَانِ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ عَلَيْهِ أَنِشَاءُ قُلُوبًا فَتَحَرَّجُهُ اللَّهُ لَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ،

اور اگر علت کامل یعنی تہہ ہی تو علت تمامہ اور معلول کا وجود ساتھ ساتھ ہوتا ہے،  
اس بنا پر عالم کو بھی قدیم ہونا چاہیئے،

قرآن نے بتایا ہے کہ بندوں کے تمام افعال خدا کے حکم سے ہوتے ہیں، اس کے  
بعد یہ سوالات کہ اس کا حکم ہی فعل کے وجود کا سبب ہوتا ہے، یا بندہ کے عمل کو بھی دخل  
ہوتا ہے، اگر دخل نہیں تو بندہ کو مجبور محض کہنا ہوگا، اگر دخل ہے تو یہ دخل موثر ہے یا  
غیر موثر، اگر موثر ہے تو حقیقت وہ اپنے فعل کا آپ خالق ہوا، اور اگر غیر موثر ہے  
تو دوسرے معنی میں جبر ہے،

یہ تمام مذکورہ بالا مسائل اور ادون کی جو تحقیقین کی گئی ہیں وہ نفیاً یا اثباتاً کسی  
نہ کسی فرقہ کا معتقد علیہ اور مسلک ہیں، لیکن تم نے دیکھا کہ عقلی توہم پرستی کے اعتراضات  
سے ان میں سے کوئی شق بھی بری نہیں، یہ اعتراضات یا لوازم مستحیلہ، یا عقلی سرگردانیان  
کیون پیدا ہوئیں، اسلئے کہ ہم قرآن کی یقینات پر قناعت نہیں کرتے، اور ان امور  
کی تشریح چاہتے ہیں، جن کی تشریح سے عقل انسانی عاجز ہے اور ہماری عقلی زندگی کے  
لیئے وہ غیر ضروری ہیں،

اگر ہم اپنے معتقدات کے احاطہ کو اس دائرہ کے اندر کر لیں جس کو وحی الہی  
کے پھر کارنے سطح اسلام پر کھینچا ہے، تو یہ حصار ہمارے لئے یقیناً قلعہ روہین کا کام دیگا،  
اور ہم ان بہت سے خدشوں اور حلوں سے محفوظ ہو جائینگے، جو قرآن کی تصریحات  
کے سبب نہیں بلکہ خود ہمارے عقلی تفصیلات کے باعث ہم پر عائد ہوتے ہیں، اور غلطی سے  
ہم ان کا مستوجب اپنے مذہب کو قرار دیتے ہیں، تمام فرق اسلامیہ سے سب سے بڑی  
غلطی یہ ہوئی کہ عقل اور فلسفہ نے جس امر کے متعلق بھی کوئی جواب چاہا اور انھوں نے اپنے



ناخن تدبیر سے اس کو صل کیا، اور نفیاً یا اثباتاً اس کو داخل مذہب کر لیا،  
 اشاعرہ سے بہت کچھ ہم کو امیدین ہو سکتی یقین، لیکن یہ دیکھ کر کس قدر افسوس  
 ہوگا کہ اس غلطی عام سے وہ بھی اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے، یہاں تک کہ خالص فلسفیانہ مسائل  
 جن کو مذہب سے ایک ذرہ تعلق نہیں، مثلاً جزؤ الذی لا یتجزیٰ کی بحث، طفرہ کا مسئلہ،  
 رویت کے اسباب، استطاعت مع الفعل کی بحث وغیرہ اس کو بھی اونھوں نے کفر  
 اور اسلام کا معیار قرار دے لیا ہے، اگر آج ہمارے عقائد کی کتابوں کی چھان بین کی جائے  
 تو نصف سے زیادہ اوراق انھیں مباحث سے مملو ہونگے، حالانکہ حق یہ تھا کہ جن مسائل سے  
 اسلام خاموش تھا وہ نفیاً یا اثباتاً عقائد میں داخل ہی نہ ہوتے، اور مذہبی حیثیت سے ان  
 سوالات کا جواب سکوت تھا کہ اگر وہ مذہب کے ضروری جزو تھے تو شارع ان کے بیان سے  
 خاموش نہ رہتا، اور جب وہ خاموش رہا تو معلوم ہوا کہ وہ مذہب سے متعلق نہیں، اور نہ ان کا  
 جاننا ہمارے لیے مذہباً ضروری ہے،

الغرض اہل السنۃ نے جو صراطِ مستقیم اختیار کیا وہی حقیقت اس طوفانِ افکار  
 اور طغیانِ خیالات کی حالت میں سفینۂ نوح ہو سکتا تھا، لیکن یہ کس درجہ افسوسناک امر ہے  
 کہ وہ بوہرس کے بعد تیسری چوتھی صدی میں جب مسلمانوں میں فلسفہ نے عروج حاصل کر لیا اور  
 ممالکِ اسلامیہ کے در و دیوار سے اس کی آواز باز گشت آنے لگی، خود اہل السنۃ میں سے  
 چند افراد اٹھے اور قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر اونھوں نے اہل السنۃ اور دیگر فرقوں کے درمیان  
 ایک نیا راستہ پیدا کیا، اور عقل و نقل اور فلسفہ و سنت کے درمیان ایک متذبذب صورت  
 طریقہ کو اپنا مسلک قرار دیا، اونھوں نے یہ سمجھا کہ اس طریقہ سے وہ عقل و نقل اور فلسفہ و  
 شریعت کی تطبیق میں نہ تو مترکہ کی طرح قرآن و سنت سے دور پڑ جائینگے، اور نہ اربابِ ظواہر

اور محدثین کی طرح عقلائے فلسفہ کے لئے قابل مضحکہ رہیں گے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اون کے معتقدات و مسائل نہ تو اصل قرآن و سنت کے مطابق ہی رہے، اور نہ عقل و فلسفہ کے دربار ہی میں وہ رسوخ پاسکے،

مثلاً ایک طرف تو انھوں نے معتزلہ کے ساتھ ہو کر خدا کی جسمیت سے انکار کیا، اور ان آیتوں میں جن میں ہاتھ اور منہ کا ذکر تھا تاویل کی، اور دوسری طرف ظاہریہ کے ساتھ خدا کی رویت کا اقرار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اہل السنۃ کا ساتھ دے سکے اور نہ فلسفہ کی معیت برقرار رکھی، اون کو بدہیات کا انکار کرنا پڑا کہ رویت کے لئے عمریٰ کا جسم ہونا، تمیز ہونا، ذی لون ہونا، آنکھ کے سامنے ہونا، اس سے ایک مسافت پر ہونا، ضروری نہیں، ایک اور مسئلہ میں یعنی مسئلہ جبر و قدر میں انھوں نے اسی قسم کا توسط اختیار کیا، ایک طرف تو یہ کہا کہ تمام افعال کا خالق خدا ہے، یہ کہہ کر گویا اپنے کو معتزلہ اور قدریہ سے الگ کیا، دوسری طرف انسان کے لئے کسب ثابت کیا کہ جبر نہ لازم آئے، لیکن جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ کسب فعل کے وجود کے لئے موثر بھی ہے، تو جواب نفی میں دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جبر یہ سے کچھ زیادہ اچھے نہیں رہے،

استاذ مرحوم نے خوب کہا ہے،

دو دل بون دین رہ سخت رعیت اسالک  
فعل ہستم ز کفر خود کہ دار دلوائے ایمان ہم

(۸)

جس طرح اسلام میں بہت سے ایسے فرقے ہیں جو حقیقت دائرۃ اسلام میں داخل نہیں، اسی طرح بہت سے ایسے فرقے بھی ہیں جو خود کو اہل السنۃ کہتے ہیں لیکن حقیقتہً وہ ان میں سے نہیں ہیں، سبب یہ ہے کہ قدامے اہل السنۃ نے جو اصول قرار دیئے تھے،

دیگر عقل پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر متاخرین نے ان میں صریح تحریف کی اور صحیح راستہ سے انحراف کیا، اور بالین ہمہ وہ اپنے کو اہل السنۃ سمجھتے ہیں، بلکہ لفظ اہل السنۃ کا صحیح مخاطب صرف اپنے ہی کو جانتے ہیں،

تیسری چوتھی صدی سے اہل السنۃ میں عظیم الشان شاخون میں تقسیم ہیں، اشاعرہ، حنابلہ، اور ماتریدیہ، اشاعرہ امام ابو الحسن اشعری المتوفی ۳۲۰ھ کی طرف منسوب ہیں، اور امام شافعیؒ کے عقائد کے شراح سمجھے جاتے ہیں، اسلئے تمام شوافع اشعری ہیں، حنابلہ اپنے کو احمد بن حنبلؒ کا پیرو کہتے ہیں، ماتریدیہ، امام ابو منصور ماتریدی کے پیرو ہیں، جو بچند واسطہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے، اسلئے احناف نے عقائد میں ان کو اپنا امام مانا،

یہ فرقے جن بزرگوں کو اپنا بانی اور امام سمجھتے ہیں، یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ صحیح استاد کے رو سے ان کی کوئی تصنیف عقائد میں ثابت نہیں ہے، جستہ جستہ جو ان کے اقوال ملتے ہیں وہ قدماے اہل السنۃ اور سلف صالح کے مطابق ہیں، بہر حال متاخرین اہل السنۃ سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ان مسائل کے متعلق جن سے شریعت خاموش تھی اون کو حوالہ علم آسمیٰ کرنے کے بجائے اون کی نسبت دیگر فرقوں کی طرح ادعائی پہلو اختیار کیا اور بہت سے فلسفیانہ مسائل کو جن کو شریعت اصلاً تعلق نہ تھا، اون کو داخل عقائد کر دیا،

حنابلہ سب سے زیادہ اہل السنۃ ہونے کے مدعی ہیں، اور اشاعرہ کو اسی طرح وہ مگرہ جانتے ہیں جس طرح اشاعرہ، معتزلہ کو چنانچہ بغداد میں حنابلہ اور اشاعرہ کی محرکہ آرائیان بدر و جنین کے جوش جہاد کو زندہ کرتی تھیں، اعاذنا اللہ

ماتریدیہ اپنی تصنیفات میں مثلاً عقیدہ بزوسی اور تمہید ابوسالم وغیرہ میں اپنے کو  
اشاعرہ کے مقابلہ میں تنہا اہل السنۃ کہتے ہیں، یہی حال اشاعرہ کا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر  
تصریحات سلف سے ان متاخرین کے خیالات کو ملایا جائے تو معلوم ہو جائے،  
کہ یاران دیگر سے رami پرستند

ظاہر یہ اور خیال بلکہ یہ کہنا کہ خدا آسمان پر ہے اور تخت پر بیٹھا ہے، اور رحیمہ اور  
معز لہ کا، جن کے ساتھ کہ **اشاعرہ** اور ماتریدیہ وغیرہ مدعیان سنت بھی  
ہم نواہین یہ کہنا کہ خدا کسی مکان میں ممکن نہیں ہے اور تعین جہت سے پاک ہے، شریعت کے  
حدوسے متجاوز ہونے میں دونوں برابر ہیں، محسمہ کا یہ قول کہ خدا کے جسم ہے، اس کے  
ہاتھ، پاؤں، اور منہ ہے، اور معز لہ کے ساتھ اشاعرہ و ماتریدیہ کا یہ اعتقاد کہ وہ  
نہ جسم ہے نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ متشکل ہے نہ متصور ہے، کتاب و سنت کی دلالت  
نفس سے دونوں خالی ہیں، اگر امیہ کا تمام صفات کو حادث کہنا اور معز لہ کا یہ اعتقاد کہ  
کلام الہی حادث ہے، سرمایہ بدعتیگی اور مخزن صدگوئے کفر سمجھا جاتا ہے، لیکن اشاعرہ اگر صفات  
اضافی مثلاً صفت خلائی و رزائی کو ازلی اور قدیم نہ کہیں تو کیوں ان کو بھی بڑا نہ کہا جائے،  
کہ شریعت جس طرح اول و ثانی سے خاموش ہے ثالث کی بھی اس نے تصریح نہیں کی ہے،  
جیسی طریقہ سے معز لہ کا یہ قول کہ صفات عین ذات خدا ہیں، خیال بلکہ کا یہ اعتقاد کہ صفات  
غیر ذات ہیں اور اشاعرہ اور ماتریدیہ کا یہ خیال کہ وہ نہ عین نہ غیر ہیں، اصل  
شریعت سے عدول اور خروج میں تینوں برابر ہیں کہ اول میں سے شریعت نے کسی کی  
تصریح نہیں کی ہے، جس پر یہ کا یہ قول کہ انسان جمادات اور نباتات کی طرح مسلوب الاختیار  
قدریہ کا یہ کہنا کہ وہ ہر طرح سے کامل الاختیار ہے، اشاعرہ کا یہ بیان کہ ہمارے کسب و

بھی اس کے اندر دخل ہے، لیکن اس فعل پر ہمارے کسب کا کوئی اثر نہیں بلکہ براہ راست خدا کا وہ فعل ہے، مگر یہ کہ یہ خیال کہ خدا کے خلق کے ساتھ ہمارے کسب کو فعل میں بھی دخل ہے، جس کے یہی ہیں کہ ہر فعل کے بندہ اور خدا دونوں مشترک طور سے خالق ہیں، یہ چاروں خیالات اصل شریعت سے دوری میں کیساں ہیں،

قرآن مجید کو معتزلہ مخلوق اور حادث کہتے ہیں، اور اس کی بنا پر اس زمانہ کے ظاہر بین محدثین نے اون کو کافر کہا، اور علی الرغم یہ اعتقاد ظاہر کیا کہ قرآن نہ صرف معنوی حیثیت سے بلکہ اس کے الفاظ تک غیر مخلوق اور حادث ہیں، دلیل سنئے کہ قرآن میں اللہ کا نام ہے، کیا اللہ مخلوق اور حادث ہے؟ اور جو اس کو مخلوق اور غیر حادث کہے وہ کافر نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر انھیں میں سے متاخرین یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ اس احمقانہ دلیل کو قابل مضحکہ سمجھ کر رو کر دیا، اور ایک فلسفیانہ تدقیق پیدا کر کے تفصیل کی کہ کلام کا ایک مفہوم ہوتا ہے، جو تکلم کے دل میں ہوتا ہے، اور ایک الفاظ کا مجموعہ جس کے ذریعہ سے اصل مفہوم اور کلام دلی کی تعبیر ہوتی ہے، اول قدیم ہے، اور غیر مخلوق اور ثانی حادث اور مخلوق ہے،

لیکن اسی زمانہ میں جو لوگ اہل نظر اور خالص کتاب و سنت کے پیرو تھے انھوں نے اس عامیانہ شور و غل کی پروا نہ کی، اور نہ معتزلہ کے جوش مخالفت میں صدق اور راستی کا سرشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹا، انھوں نے صاف کہا، قرآن خدا کا کلام ہے اور پس انہم خالق کہیں گے مخلوق، یہ بالکل صحیح جواب تھا کہ اصل شریعت کے رو سے اس کو مخلوق کہنا جس طرح شرعاً غیر مخلوق کہنا اس سے کم نہیں،

ان تصریحات سے واضح ہو گا کہ تارکین سنت اور متاخرین اہل سنت جنھوں نے

مستزلہ اور دیگر عقل پرست فرقوں سے مرعوب ہو کر قدمائے اہل سنت کے اصول میں ترمیم کی اور اپنے مذہب کو قواعد عقلی کے مطابق بنانے کی کوشش کی، نتیجہ کے رو سے ان دونوں میں بہت ہی کم فرق ہے، اور حقیقت ان متاخرین کے اقوال کو سلف صالح اور اہل سنت کے عقائد اور خیالات سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اس قدر جس قدر وہ کتاب و سنت سے قریب ہیں،

جب ایک مسئلہ کے متعلق شریعت نے کچھ نہیں بتایا اور نہ اس کا جاننا اور اس کی اپنی عقل سے تفصیل کرنی مدار ایمان بتایا، اور نہ کسی حیثیت سے داعی اسلام نے اپنے مومنین سے اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا، اس کے متعلق تمہارا فیض یا اثباتا کوئی بھی پہلو اختیار کرتا اور اس کو اسلام کا بنی قرار دینا کیا حقیقت رسی ہے؟ کیا اس بارہ میں تمہارا فعل دوسرے فرقوں کے فعل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ متحسن ہوگا؟ اگر ان گروہوں کے کھولنے کے لئے تمہاری عقل رہبر بن سکتی ہو تو تم آگے بھی بڑھ سکتے ہو، اور نفوذ باللہ پیغمبروں کی آمد و بشت سے مستغنی بھی بنا سکتے ہو،

آنحضرت صلعم کے دست مبارک پر تقریباً ایک لاکھ نفوس قدسیہ نے ایمان و اسلام کی بیعت کی، لیکن کیا تم کو وہ دفعات معلوم ہیں جن پر ان کے ایمان اور اسلام کی بنا تھی کیا تمہارے پیدا کردہ میگزینوں عقائد کلامی میں سے ایک بھی ان کے سامنے پیش کیا گیا، اگر نہیں تو اپنے خود ساختہ اصول کی حیثیت سے نفوذ باللہ تم ان کو کیا کہو گے، ان کا ایمان صرف یہ تھا جس کو سورہ بقرہ کے اول و آخرین بیان کیا گیا ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ  
اَوْس پر ایمان لایا، اور تمام مومنین، ہر ایک، خدا پر  
اَدْبِهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اَمْنٍ  
پیغمبر کو کچھ اوس کے خدا کی طرف سے اُترا

بِاِلٰهٍ وَ مَلٰئِكَةٍ وَ كُتُبِهِ وَ  
 رُسُلِهِ لَا يَنفَرِقُ بَيْنَ اَحَدٍ  
 مِّنْ رُّسُلِهِ (بقرہ آخر)  
 اِيعٰذُ شَعْنٍ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا  
 اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْآخِرَةِ هُمْ  
 يٰعٰقِلُونَ (بقرہ اول)

ایمان لایا، اوس کے تمام فرشتوں پر اوس کی تمام  
 کتابوں پر اوس کے تمام پیغمبروں پر ہم اوس کے  
 پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔  
 (مثنیٰ لوگ) جو کچھ تجھ پر اُترا اور تیرے پہلوں پر  
 اُترا ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان  
 رکھتے ہیں،

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں خدا نے بتایا ہے کہ کن چیزوں پر ایمان لانا  
 ضروری ہے جب کوئی شخص قرآن پر ایمان لایا تو اوس کے اندر جو کچھ ہی اجمالاً یا تفصیلاً اُن  
 سب پر ایمان لایا، خدا کے جو صفات اُس میں مذکور ہیں، کتب الہی، ملائکہ اور پیغمبروں کے  
 متعلق اوس میں جو کچھ ہی، قیامت، جہنم و نشت، دوزخ و بہشت کی نسبت جو حالات اوس میں  
 مذکور ہیں، یہ تمام چیزیں اوس کے اندر داخل ہو گئیں، چنانچہ قدائے اہل سنت اور سلف  
 صالح کا اعتقاد یہ تھا کہ اُن میں سے ہر چیز پر ایمان اسی حیثیت سے اور اسی حد تک لانا  
 ضروری ہے، جہاں تک قرآن مجید نے اس کا مطالبہ کیا ہے، یا جہاں تک سنت صحیح اور  
 متواتر نے ثابت کر دیا ہے، کیونکہ یہ متفق طور سے ثابت ہے کہ عقائد کا ثبوت صرف قرآن مجید سے  
 ہو سکتا ہے اور احادیث میں سے صرف ان حدیثوں سے جو بذریعہ تواتر مروی ہیں خبر واحد  
 مستلزم یقین نہیں ہے، اس لئے وہ یقینیات کا مبنی نہیں قرار پا سکتی، اور ایمان یقینیات کا  
 نام ہے،

اس نکتہ کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب سے ظاہر یہ اور عام حدیثیں سخت غلطی میں مبتلا  
 ہوئے ہیں انھوں نے رطب و یابس اور احاد و متواتر کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اور

کہتے ہیں کہ اس پر ایمان لاد، مثال کی طور پر پیمپی کی کتاب الاسماء والصفات دیکھو حالانکہ یہی کام اگر احتیاط سے عمل میں لایا جاتا تو حقیقت محدثین ہی کا علم کلام اسلام کا علم کلام ہو سکتا تھا،

(۹)

شبِ آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

کل کی نشست میں ہم نے بتایا تھا کہ قدمائے اہل السنۃ کے یہ دو اصول تھے،  
(۱) آنحضرت صلعم عقائد اور اعمال کے متعلق اپنی امت کو جو کچھ تعلیم و تلقین فرمائے،  
اوس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کی کمی نہیں ہو سکتی،

(۲) خدا کی ذات و صفات و دیگر عقاید کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر سے  
جو اثر جو کچھ ثابت ہے، اور اون کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک اونھوں نے  
تفسیر و تشریح کی ہے اسی پر ایمان لانا واجب ہے، اپنی عقل و قیاس اور استنباط سے  
تفسیر و تشریح کرنی صحیح نہیں اور نہ اس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جز ہے،

یہ دو اصول ایسے ہیں جن کے اثبات کے لیے کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں،  
کیونکہ جیسا ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ اکثر ایسے مسائل ہیں جن کی نسبت عقل کا تقیاً  
یا اثباتاً ہر قسم کا فیصلہ ناقابل لحاظ ہو کہ یہ حدود اس کے دسترس سے باہر ہیں، اور اسی لئے  
ہم کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے جو ہمارے دسترس سے باہر کی چیزوں کو ہمارے حق میں  
جہاں تک مفید و نافع تعلیم دے، اور جب یہ مقدمہ صحیح ہے تو ان مسائل کی خالص عقل کے  
رو سے تفسیر یا اضافہ یا اسقاط و حقیقت اپنے پہلے دعویٰ کا ابطال ہے،

لیکن اس قیاس کو چھوڑ کر ہم کو قرآن و سنت سے ان اصولوں کی صحت ثابت



کرنی پائیے، اس کے لئے ہم اپنے دوستوں کو اپنی پہلی اور دوسری نشست کی تقریریں  
یا دو لائے ہیں، جن میں قرآن و سنت سے اس اصول کو ثابت کیا گیا ہے، آج کے جلسہ میں  
ایک سلف اور قدامت اہل السنۃ کے اقوال سے دکھانا ہے کہ ان رسمی فرقوں کے پیدا ہونے  
سے پہلے اہل السنۃ کے کیا معنی تھے،

امام مالک بن انس اہل السنۃ کا عقیدہ بتاتے ہیں،

الکلام فی الدین اکبرہ ولا یزال	عقائد میں گفتگو کرنا پسند کرتا ہوں، اور ہمیشہ
اہل بلدنا یکرہونہ دینھون	ہمارے شہر (مدینہ) کے علما اس کو ناپسند کرتے ہیں
عنه نحو الکلام فی سلسلہ جہم	ہیں اور اس سے روکتے رہے ہیں مثلاً جہم کی رائے
والقدروما اشبه ذالک وما	اور قدر میں گفتگو کرنا،
احب الکلام الا فیما تحتہ عمل	میں بحث و مباحثہ ان امور میں ناپسند کرتا ہوں
فاما الکلام فی دین اللہ و فی	جن کے تحت میں کوئی عمل ہو، لیکن خدا کے عقائد
اللہ عزوجل فالسکوت	اور خود خدا کی ذات میں سکوت میرے نزدیک
احب الی کافی دایت اہل	پسندیدہ ہے، کیونکہ ہم نے اپنے شہر کے علما کو دیکھا ہے
بلدنا ینہون عن الکلام فی	کہ عقائد میں گفتگو کرنے سے وہ روکتے تھے، اور ان
الدین الا فیما تحتہ عمل (راجع بیان العلم علیہ)	امور میں کرتے تھے جن کو عمل سے تعلق ہو،

امام موصوف نے نہ صرف یہ اپنا اصول بتایا، بلکہ اپنے تمام پیشرووں کا طریقہ  
یہی بتایا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلف کی زندگی کی اصلی روش، عمل تھاخیل نہیں،  
وہ صرف ان امور میں گفتگو کرتے تھے جن پر عملاً بھی ہم کو کاربند ہونا ہے،  
امام بخاری علیہ السلام ان افعال و عبادت میں سلف صالحین کا مذہب سمجھتے ہیں،

انھوں نے ان مشکل مسائل میں بحث و گفتگو کرتا  
ناپسند کیا اور جو لوگ ان میں گفتگو غور اور نزاع کرتے  
تھے ان سے پرہیز کیا، لیکن جن مسائل میں علم خدا کی طرف سے  
آیا ہو یا آنحضرت صلعم نے اوس کو بیان کر دیا ہو،  
اس میں انھوں نے غور و فکر اور بحث کی،

وانھم کرھوا للبحث والتقیب  
عن الاشیاء الغامضة وتجنبھا  
اہل الکلام والخفاص والتنازع  
الا فیماء جاء فیہ العلم فیہ  
رسول اللہ صلعم

امام ترمذی ائمہ سنت کا اصول بتاتے ہیں۔

ائمہ اہل علم جیسے سفیان ثوری، مالک بن  
اس بن سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن مبارک  
وغیرہ کا اس بارہ میں مذہب یہ تھا کہ انھوں نے  
ان چیزوں کی روایت کی اور کہا ہم ان  
حدیثوں کی روایت کرتے ہیں اور ان پر  
ایمان رکھتے ہیں، اور یہ نہیں کہا جائے کہ یہ  
کیون کر ہے، اور اسی مذہب کو اہل حدیث  
نے اختیار کیا ہے کہ ان باتوں کی روایت  
کردن جس طرح وہ آئی ہیں، اور ان پر ایمان  
رکھا جائے، اور ان کی تفسیر نہ کی جائے اور  
نہ وہم کیا جائے اور نہ کہیے ”کہا جائے، اہل علم کا  
یہی مذہب ہے، اور اسی کو پسند  
کیا ہے،

والمذہب فی ہذا عند اہل  
العلم من الائمۃ مثل سفیان  
الثوری ومالك بن انس وسفیان  
بن عیینہ وابن المبارک وویکیع  
وغیرہم انھم درووا ہذا الاشیاء  
وقالوا نردی ہذا الاحادیث  
ونؤمن بہا ولا یقال کیف  
وہذا الذی اختارہ اہل الحدیث  
ان یرووا ہذا الاشیاء  
كما جاءت ویؤمن بہا ولا تفسر  
ولا یتدہم ولا یقال کیف و  
ہذا امواہل العلم الذی  
اختارہ وذهبوا الیہ،

حدث ابن عبد البر قدامہ اہل سنت کا مسلک بتاتے ہیں،

لان الله عز وجل لا يوصف عند  
الجماعة اهل السنة الا بما وصف  
به نفسه او وصف به رسوله او  
اجمعت الامة عليه وليس كمثله  
شيء في دلت بقياس او بما معان  
نظرو قد نهينا عن الفكر  
في الله وامرنا بالتفكر في خلقه  
العدل عليه،

اسلئے کہ خدا اپنے پاک کا وصف، جماعت  
یعنی اہل السنۃ کے نزدیک وہی ہو سکتا ہو  
جس کو خود خدا نے بیان کیا ہو یا اس کے  
رسول نے یا تمام امت نے اس پر اجماع  
کر لیا ہے خدا کی شے کوئی شے تو ہے نہیں  
پھر قیاس یا غور و فکر سے وہ کیونکر دریافت  
کیا جاسکتا ہے ہم کو خدا کی ذات میں فکر کرنے سے  
منع کیا گیا ہو، اور اس کی مخلوق و مہنوع میں روئے فکر کا

(جامع بیان العلوص ص ۱۵۱- مصر)

امام بیہقی علمائے سنت کا متفق علیہ اصول بتاتے ہیں،

فاما الاستواء فالمتقدمون  
من اصحابنا رضی الله عنهم كانوا  
لا يفسرون ولا يتكلمون فيه  
كغير مذهبهم في امثال  
ذالك،

لیکن عرش پر برابر ہونا، تو قدامہ اہل سنت  
اس کی تغیر نہیں کرتے تھے اور نہ اس میں  
بحث کرتے تھے، جیسا کہ اون کا مذہب  
اس قسم کے اور مسائل میں بھی یہی

دارقطنی میں نہش خراسانی کی روایت سے ایک حدیث ہے، کہ کہ عظمہ کی مسجد شیف میں

۱۔ آخر کتاب الاثر، نہش گو ضیف راوی ہوا اسلئے مکن یہ کہ یہ حدیث آنحضرت تک صحیح نہ ہو لیکن کم از کم اس سے

اس کے زمانہ کا حال معلوم ہوتا ہو وہ تابعین کے زمانہ میں تھا،

ضحاک بن مزاحم، حسن بن ابی الحسن، طاؤس مینى، کچول شامى عمرو بن دینار کی جو اپنے اپنے خطہ کے امام اور مشہور محدث اور تابعی تھے جمع ہوئے، اور قد رین گفتگو میں شروع ہوئے، طاؤس جو سب میں مقبول تھے بولے، ذرا آپ لوگ چپ رہئے تو میں حضرت ابو درداء کی حدیث آپ کو سنائوں، آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے،

ان الله افترض عليكم فروا نص      خدا نے چند باتیں فرض کی ہیں، اول کو ضائع نہ کرو  
فلا تضیعوا ما وحد لکم حدود      اور تمہارے لئے کچھ حدود قائم کر دیئے ہیں اول سے بچاؤ  
فلا تغیروها ونہا لکم عن اشیاء      نہ کرو، اور چند باتوں سے منع کیا ہے اول سے باز  
فلا تتسکعوا وسکت عن اشیاء      رہو، اور بغیر بھول چوک کے بعض باتوں  
من غیر نسیان فلا تکلفوا رحمة      سے وہ خاموش رہا اول میں نہ برہم کیے  
من ربکم فاقبلوها،      کوشش نہ کرو، خدا کی رحمت اس کو قبول کرو

حافظ ابن حجر نے اس موقع پر جو تقریر کی ہے وہ سننے کے قابل ہے۔  
فرماتے ہیں،

ان مسائل میں تاویل کرنا آنحضرت صلعم سے اور نہ کسی صحابی سے، صحیح طریقہ سے مروی ہے، اور نہ اس بات کی مانعت آتی ہے کہ ان مسائل کو بیان نہ کیا جائے، آنحضرت صلعم کو خدا کی طرف سے حکم تھا کہ جو کچھ تمہارا زل ہو وہ بیرون پہنچاؤ، یہ بھی خدا نے فرمادیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم آج اسے مکمل کر دیا میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور باوجود اس کے آپ ان مسائل کا ذکر نہ فرماتے یہ محال ہے اور اس کی تفسیر نہ ہو سکے کہ خدا کی طرف کن صفات کی نسبت ہو سکتی ہے، اور کن کی نہیں ہو سکتی؟ حالانکہ آپ نے تمام صحابہ کو تاکید فرمادی تھی کہ جو لوگ

آپ کے سامنے موجود ہوں وہ آپ کے احکام اور لوگوں تک پہنچا دین جو موجود  
 نہیں، یہاں تک کہ اسی بنا پر آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک کام، ایک ایک  
 حالت، اور ایک ایک واقعہ جو آپ کے سامنے ہوا اس کو بیان کر دیا، اس سے  
 ثابت ہوتا ہے کہ انکا اس امر پر اتفاق تھا کہ ایمان اسی طرح لانا چاہیے جس طرح  
 خدا چاہتا ہے،

حافظ صاحب مقصود یہ ہے کہ خدا نے اپنے دین کے متعلق جو کچھ کہنا تھا وہ اپنے پیغمبر  
 کی زبانی انسانوں تک پہنچا دیا، صحابہ نے آپ سے جو کچھ سنا وہ اپنے بعد والوں تک پہنچا دیا،  
 یہ مسائل اگر مذہب میں داخل ہوتے تو ضروران کی تعلیم ہوتی،  
 حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں،

خدا اس سے بالا اور برتر ہے کہ وہ عقل یا حواس سے دریافت ہو سکے، یا اس میں  
 صفتیں اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض، جو ہر میں ہو کر پائے جاتے ہیں،  
 یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلمند ادراک کر سکیں یا متعارف الفاظ اور لوگوں  
 ادا کر سکیں، با اینہم یہ بھی ضرور سی ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیئے جائیں، تاکہ  
 جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے ہو جائے، ایسی حالت میں اس سے  
 چارہ نہیں کہ ان صفتوں کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے  
 نتائج اور لوازم سمجھ لیے جائیں، مثلاً ہم خدا کے لئے ”رحمت“ ثابت کرتے ہیں  
 اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے، دل کی خاص کیفیت نہیں (جس کو  
 اصل میں رحمت کہتے ہیں) اسی طریقہ سے خدا کی وسعت قدرت کے اظہار  
 کے لئے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارۃ استعمال کرنے پڑینگے جو انسانوں کی

قدرت و قوت کے لیے بوسے جاتے ہیں، کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں، اور اسی طرح تشبیہاً بہت سے الفاظ بولے جائینگے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں، بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں..... تمام آسمانی مذہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طریقہ پر بولے گئے ہیں، اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث و کاوش نہ کی جائے، اور یہی مذہب اس زمانہ کا تھا جس کے خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے، (یعنی تبع تابعین کے عہد تک) اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے جنھوں نے بغیر کسی نص قطعی اور دلیل مستحکم کے ان مسائل میں فکر و کاوش شروع کر دی،

شاہ صاحب اپنے وصایا میں جو فارسی زبان میں ایک رسالہ ہو لکھتے ہیں،  
 اول وصیت این فقیر جنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل پیوستہ  
 بتدبیر و مشغول شدن ..... و در عقائد مذہب قدر ما و اہل سنت اختیار  
 کردن و از تفصیل و تفتیش اچہ ملت تقیث نکردند اعراض نمودن و بپہلکات  
 خام متغویان التفات نکردن،

اب ہم کو اپنے بیان کردہ گزشتہ اصول کلیہ کو جزئی مسئلوں میں دکھا کر ثابت کرنا ہے،  
 کہ قدماے اہل سنت اور اس عہد کے اعتقادات ان مسائل میں کیا تھے، جن کو آنحضرت صلیع  
 نے خیر و برکت کا زمانہ فرمایا ہے،

مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر | اعتقادات میں سب سے پہلے اسی مسئلہ میں گفتگو پیدا ہوئی، یہ ایک  
 ایسا مسئلہ ہے جس کا جواب نہ صرف مذہب بلکہ فلسفہ کی زبان سے بھی مشکل ہے، یہ نہ صرف

اسلام کا مسئلہ ہو بلکہ دنیا کا کوئی مذہب اس سے خالی نہیں، اور درحقیقت مذہب کی روح اسی معجز العقول معما کے اندر پوشیدہ ہے، اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً ادعائی لوجہ میں نیا ہے مذہب پر ایک خطرناک حملہ ہے،

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے دیکھا کہ کچھ اصحاب بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، دریافت فرمایا کہ کس مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہو، عرض کی مسئلہ قدر پر، یہ سن کر آپ مقدور برافروختہ ہوئے کہ چہرہ سُرخ ہو گیا، راوسی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے روئے مبارک پر انار کے دانے پھونک دیئے ہیں، اور فرمایا تم سے پہلی قومیں اسی میں ہلاک ہوئیں، میں تاکید کرتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو،

حضرت قاسم بن محمد، حضرت صدیق اکبر کے پوتے، اور مدینہ کے دارالفقہ کے رکن اعظم تھے ایک دفعہ دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے مسئلہ قدر میں گفتگو کر رہے ہیں، فرمایا،

كفوا عما كنتم الله عنہ جس سے اللہ تعالیٰ خاموش ہو تم بھی خاموش رہو،

کلام: | مامون عباسی کے عہد خلافت میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کلام الہی قدیم ہے یا حادث ہے؟ مخلوق ہے یا غیر مخلوق، کلام چونکہ خدا کی صفت ہے، اور خدا کی ذات کی طرح قدیم اور غیر مخلوق ہونا چاہیئے، اسلئے محدثین اور ارباب ظاہر اس کے معتقد ہیں کہ کلام الہی غیر مخلوق ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ کلام خدا کی ذات کے علاوہ ہے، اور خدا کی ذات کے سوا ہر شے حادث ہے اور مخلوق ہے، قرآن کہتا ہے کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ خدا کی ذات کے سوا ہر شے فنا ہونے والی ہے، قرآن میں فرعون و ہامان کا ذکر ہے، کلام الہی اگر قدیم

سے ترمذی و قدرہ حدیث غریبہ سے ابن سعد جزویہ، تذکرہ قاسم بن محمد،

وغیرہ مخلوق ہو تو کیا یہ لوگ بھی قدیم وغیرہ مخلوق ہیں،

مقابلہ، انشاء، تائید، وغیرہ کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے، اس زمانہ کے تمام علمائے کبار اور ائمہ سنت نے اپنا یہ مذہب ظاہر کیا کہ کلام الہی غیر مخلوق اور قدیم ہے، امام احمد بن حنبل جنہوں نے فرمان شاہی کے مقابلہ میں بڑی استقامت ظاہر کی تھی، انہوں نے بھی علی الاعلان اہل السنۃ کا یہی مذہب بتایا تھا، تقصیب اور فریقانہ مخالفت کا جوش جانے دو، اور سکون خاطر کے ساتھ غور کر دو کہ کیا قرآن کو حادث و قدیم یا مخلوق وغیرہ مخلوق کہنا محمد رسول اللہ اور صحابہ کے معتقدات میں داخل تھا، اسلام کی تبلیغ صرف یہ ہو کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اس کے من اللہ ہونے کا ہم کو یقین کامل ہے، اصل یہ ہے کہ علمائے سنت نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص قرآن کو یا کلام الہی کو "مخلوق" کہے وہ کافر ہوگا، نہ اسلئے کہ اس کو "غیر مخلوق" کہنا چاہیئے تھا، بلکہ اسلئے کہ "مخلوق" کہنا جیسا کہ معتزلہ کہتے تھے بدعت اور قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معتقدات پر نئی شے کا اضافہ ہے، امام بخاری نے جزر افعال العباد میں دیگر اقوال کے ساتھ علمائے سنت کے یہ اقوال بھی لکھے ہیں،

علی بن عبد اللہ فرماتے ہیں،

القرآن کلام اللہ من قال  
انہ مخلوق فہو کافر،  
قرآن خدا کا کلام ہے جو کوئی یہ کہے گا کہ وہ  
مخلوق ہے وہ کاذب ہے،

سفیان بن عیینہ اکابر اہل سنت میں شمار ہوتے ہیں، انہوں نے نہایت غضبناک ہو کر فرمایا،

و یحکم القرآن کلام اللہ قد  
انوس تمیز قرآن خدا کا کلام ہے، میں نے



صحبت الناس واد دکتھم هذا  
عمرو بن دینار و هذا ابن  
المنکدر حتى ذکر منصور  
والاعمش و مسعر بن کدام  
فقال ابن عیینة قد تکلموا فی  
الاعتزال والرفض والقدر  
وامرأاً جتنا ب القمام فما نعرف  
القرآن الا کلام الله ومن قال  
غیر هذا فعليه لعنة الله،  
بزرگوں صحبتین اُٹھائی ہیں انکار مانہ پایا ہے  
یہ ابن دینار، یہ ابن منکدر دیہان تک کہ  
انعمون نے منصور، اعمش، مسعر ابن  
کدام کا بھی نام لیا، ان لوگوں نے  
معتزلہ ورفض اور قدریہ پر اعتراضات  
کئے اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہم  
صرف یہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کا  
کلام ہے اس کے سوا جو کوئی اور کچھ  
کھے گا وہ ملعون ہے،

ظاہر یہ ہے کہ صحابہ تک سے قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی روایتیں  
نقل کر دی ہیں، حافظ ابو احمد نے ان حدیثوں سے انکار فرمایا،  
ما ليعرف الصحابة رضى الله عنهم صحابہ کرام سے قرآن میں مطلق بحث  
الخاص في القرآن، منقول نہیں،

اسحاق بن راہویہ سے لوگوں نے پوچھا کہ قرآن کے مسئلہ میں مخلوق کی بحث جو  
پیدا ہو گئی ہے اس کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے، فرمایا،  
القرآن كلام الله وعلمه وحيه وليس قرآن خدا کا کلام اور اس کا علم اور اس کی  
وحی ہے، مخلوق نہیں ہے،

عمرو بن دینار جو بڑے بڑے اکابر صحابہ کی خدمت میں رہے تھے وہ بھی اپنا یہی  
مسک بیان کرتے تھے، اور فرماتے تھے،

علیٰ ہذا مضمنی صدر دھندلا  
 اس امت مرحومہ کا پہلا زمانہ اسی مسلک  
 الا مۃ ولہم یختلفوا فی ذالک،  
 پر گزر گیا اور اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا،  
 حضرت امام زین العابدین علی بن حسین سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا، فرمایا،  
 کتاب اللہ و کلامہ قرآن خدا کی کتاب اور اس کا کلام ہے، ایک روایت میں  
 کہ انھوں نے فرمایا ایسے بالخالق و لا بالخلق و لکن کلام الخالق قرآن نہ خالق ہی  
 نہ مخلوق ہی بلکہ خالق کا کلام ہے، جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں اون کو خالق نہیں تو خالق کا  
 جزو تو قرآن کو تسلیم کرنا پڑے گا،

بعینہ یہی جواب امام جعفر صادق سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا، ایسے  
 بالخالق و لا بالخلق و لکن کلام اللہ تعالیٰ نہ خالق ہے نہ مخلوق لیکن  
 خدا سے پاک کا کلام ہے، امام عبد اللہ بن مبارک کا بھی یہی مذہب ہے ایسے  
 بالخالق و لا بخلق،

منصور بن عمار ایک محدث ہیں، اون سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ کلام  
 اسی عین خدا ہے یا جزو خدا ہے یا غیر خدا ہے، انھوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ  
 ہم سب کو فقہ سے بچائے اور اہل السنۃ و الجماعۃ میں سے بنائے پیغمبروں کے بعد  
 جس دن کے لئے خدا پر کوئی حجت نہیں ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی نسبت یہ بحث برکت  
 جس میں سائل اور مجیب دونوں شریک ہیں، سائل اس میں پڑتا ہے جو اس پر فرض  
 نہیں اور مجیب تکلف دہ کرتا ہے جو اس پر فرض نہیں، خدا کے سوا میں کسی کو خالق  
 نہیں کہتا، اور اس کے سوا سب مخلوق ہے، قرآن خدا کا کلام ہے، اس کے بعد  
 رک جاؤ، قرآن کی کوئی صفت اپنی طرف سے نکر و نہ گراہ ہو گے، اسی قسم کے

اقوال اور ائمہ سے بھی ثابت ہیں،

استواء | اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، اور ہر جگہ ہے، قرآن مجید میں یہ دونوں باتیں

مذکور ہیں، یہ بھی ہے کہ،

أَيُّهَا لَوْ لَقَا أَفْتَمَّ وَجْهَ اللَّهِ

جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا ہے،

یہ بھی مذکور ہے،

الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى

خدا تخت پر برابر ہوا،

بعض ائمہ ان آیتوں کے معنی یہ لیتے ہیں، کہ خدا وجودِ آسمان پر ہی لیکن اپنے

علم کی رو سے وہ ہر جگہ ہے، جمیعہ کا اعتقاد یہ ہے کہ خدا اپنے وجود کے لحاظ سے

ہر جگہ موجود ہے، امام مالک سے کسی نے الرحمن علی العرش استوا کی

معنی دریافت کئے، انھوں نے منکر کر چھکا لیا، پھر فرمایا،

الاستواء معلوم، وکیفیتہ مجهول

استواء کے معنی معلوم ہیں، اس کی کیفیت

والایمان بہ واجب والمسائل عند

مجهول ہر اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی

نسبت بحث و سوال کرنا بدعت ہے،

بدعت

درحقیقت امام مالک نے ان چند فرقوں میں قدمائے اہل سنت کے اصول

کلیہ کی تعلیم فرمادی ہے اور یہی وہ اصول ہے جو ہر قسم کے ایجادات اور اعتراضات

عقلی کے لیے سپر ہے، انھوں نے اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی ہے، انھوں نے

کہا کہ اگر تمہارے اعتقادات کی بنیاد جدل و مناظرہ اور دلائل عقلی پر ہے تو بالکل

ممکن ہے کہ کل تم سے زیادہ پر زور اور بولنے والا آدمی تمہارے سامنے آجائے

اور اپنے دلائل سے تمہیں مغول کر دے، تو کیا تم اپنا مذہب چھوڑ دے گے اور پر سونے

زیادہ طبیعت دار اور چلتا ہوا تم سے دو بدو ہو اور وہ کل کے دلائل کو جن کو سنکر تم معقول ہو گئے تھے پرزہ پرزہ کر دے تو کیا پھر اپنا نیا مذہب بھی بدل دو گے، اور اس طرح ہر نئے دن کے آفتاب کے ساتھ تمہارا مذہب ڈوبتا نکلتا رہے گا،

بعض شبہات کا ازالہ یہ پورا سلسلہ مضمون پڑھکر ممکن ہے کہ بعض صاحبوں کو یہ شک پیدا ہو کہ اہل اسنتہ کے نزدیک مذہب عقل کے خلاف چیز ہے یا کم از کم یہ کہ وہ مذہب کا عقل کے موافق ہونا ضروری نہیں سمجھتے ہیں،

اس سوال کے حل کرنے میں دو باتیں قابلِ ملاحظہ ہیں، اول یہ کہ ہم مذہب کو جن عقائد و اعمال کا مجموعہ سمجھتے ہیں اولن کا اس قدر حصہ جس کو صاحبِ بشریعت نے ہم پر کھولی دیا ہے اور جو حقیقت مذہب ہے اس نے اس کے تمام اصول و فروغ بھی ہم کو کھولنا دیئے ہیں، اس کا ایک ذرہ خلاف عقل نہیں ہے اس کے دلائل وہی صحیح ہیں جو جو عقلیت نے اپنے دعویٰ کے ساتھ پیش کیئے ہیں اور وہ تمام عقل کے مطابق ہیں، لیکن وہ حصہ جو حقیقت مذہب کا جز نہیں، یعنی ہمارے علم کلام کے وہ عناصر جو قرآن اور سنت صحیحہ سے اخذ نہیں اور جو حقیقت اس جسم کا مادہ فاسد ہے، ممکن ہے کہ وہ خلاف عقل اور مجموعہ محالات ہو (۲) دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب ہم ایک شے کو خلاف عقل کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ عقل نے مسلم طور سے ایک بات پہلے سے طے کر دی ہے جس کے دلائل اس قدر مضبوط ہیں کہ وہ ٹوٹ نہیں سکتے، اب مذہب اس کے خلاف ایک دوسری بات کہتا ہے جس کو مان لینا ایک ثابت شدہ عقلی مسئلہ کو باطل کر دینا ہے۔

لیکن ذرا غور کرو کہ مذہب اور عقل کے درمیان جو مسائل متنازع فیہ کہے جاتے ہیں، کیا ان کے

متعلق یہ کہنا صحیح ہو کہ عقل نے مضبوط اور مستحکم دلائل سے اس طرح ان کو ثابت کر دیا ہے کہ وہ قطعی ہو گئے ہیں اور ان کے خلاف کہنا ایک ثابت شدہ مسئلہ کا انکار ہے، حقیقتہً ایسا نہیں ہو، اسلئے کسی شے کو خلاف عقل کہہ دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ ہماری عقلیں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتیں، اور یہ سچ ہے،

شکلِ عشق نہ در حوصلہ دانش است      حل این نکته باین فکر خطا نوان کرد

(۳) آخری اعتراض تم یہ کر سکتے ہو کہ اس اصول کے مطابق تو اسلام کے مخالف مذاہب پر بھی کوئی عقلی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی صحت کا معیار بھی عقل نہیں ہو سکتا لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اسلام نے جن مسائل کی تلقین کی ہو وہ سترپا عقلی ہیں، اور جب ان کے مخالف یا متضاد کوئی ہدایت کسی مذہب میں ہو تو درحقیقت وہ خلاف عقل ہے، اور اسکی صحت کا جائزہ عقل ہی سے لیا جاسکتا ہے، ہمارا مقصد اصلی اچھی طرح سمجھ لیجئے قرآن اور سنت میچھنے بتا دیا ہے کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہے، اور اسی پر تم کو اکتفا کرنا چاہیے اور جو نہیں بتایا ہو، اس کی تشریح، اس میں زیادتی، یا اس میں کمی بذریعہ عقل جائز نہیں، یعنی اس راستہ پر ہم کو اپنی روشنی سے نہیں بلکہ خدا کی دی ہوئی روشنی کے سہارے سے چلنا چاہئے،

(۴) آخر میں ایک اور غلطی دور کر لینا چاہیے، میری تقریر سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے، کہ عقل کو بیکار محض سمجھتا ہوں، بلکہ میں عقل کو محدود الاختیار سمجھتا ہوں، ہمارے حواس جو ہماری عقل کے ذرائع علم ہیں ان سے ہماری علمی عقل جو معلومات حاصل کرتی ہے ان سے آگے بڑھ کر مادرائے محسوسات میں وہ بیکار ہے، اور یہ عقل کی تحقیر نہیں، بلکہ اس کے عقیدات اور قدرت کی واقعی تحدید ہے، بصارت ایک خاص فاصلہ کے آگے نہیں دیکھ سکتی، سماعت اپنے عمل کے لئے ایک مخصوص دائرہ چاہتی ہے جس کے بعد وہ بیکار رہنے لگتی ہے، اسی طرح

عقل انسانی ایک محدود دائرہ رکھتی ہے جس کے بعد وہ بیکار ہے، اور نیز جس طرح ہر جاسم اپنے خاص کام کے علاوہ دوسرا کام انجام نہیں دے سکتا اسی طرح عقل انسانی بھی اپنے خاص دائرہ عمل کے سوا دوسرا کام انجام نہیں دے سکتی جو شخص اس بات کا شاک ہے کہ ہم ماویات میں رہ کر اپنی عقل کے ذریعہ سے باہر اس مادہ کے حالات سے کیوں واقف نہیں ہو سکتے، اس کو سب سے پہلے یہ شکایت کرنی چاہیے کہ لکھنؤ میں بیٹھ کر ہم کو لندن کی عمارتیں کیوں نظر نہیں آتیں، اور ہندوستان میں ہم کو فرانس کے میدان جنگ کی توپوں کی آوازیں کیوں سنائی نہیں دیتیں؟

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ